آفتابِ نبوت

قرآن کریم کی صرف ایک آیت سے نبوتِ محمدیہ کی تمام امتیازی شانوں کا حکیمانہ اثبات

حصہ دوم

رشحۂ قلم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

عکسی

قیمت ۲/۲۵

ناشر

ادارۂ عثمانیہ ۱۴، ایونگ روڈ، لاہور
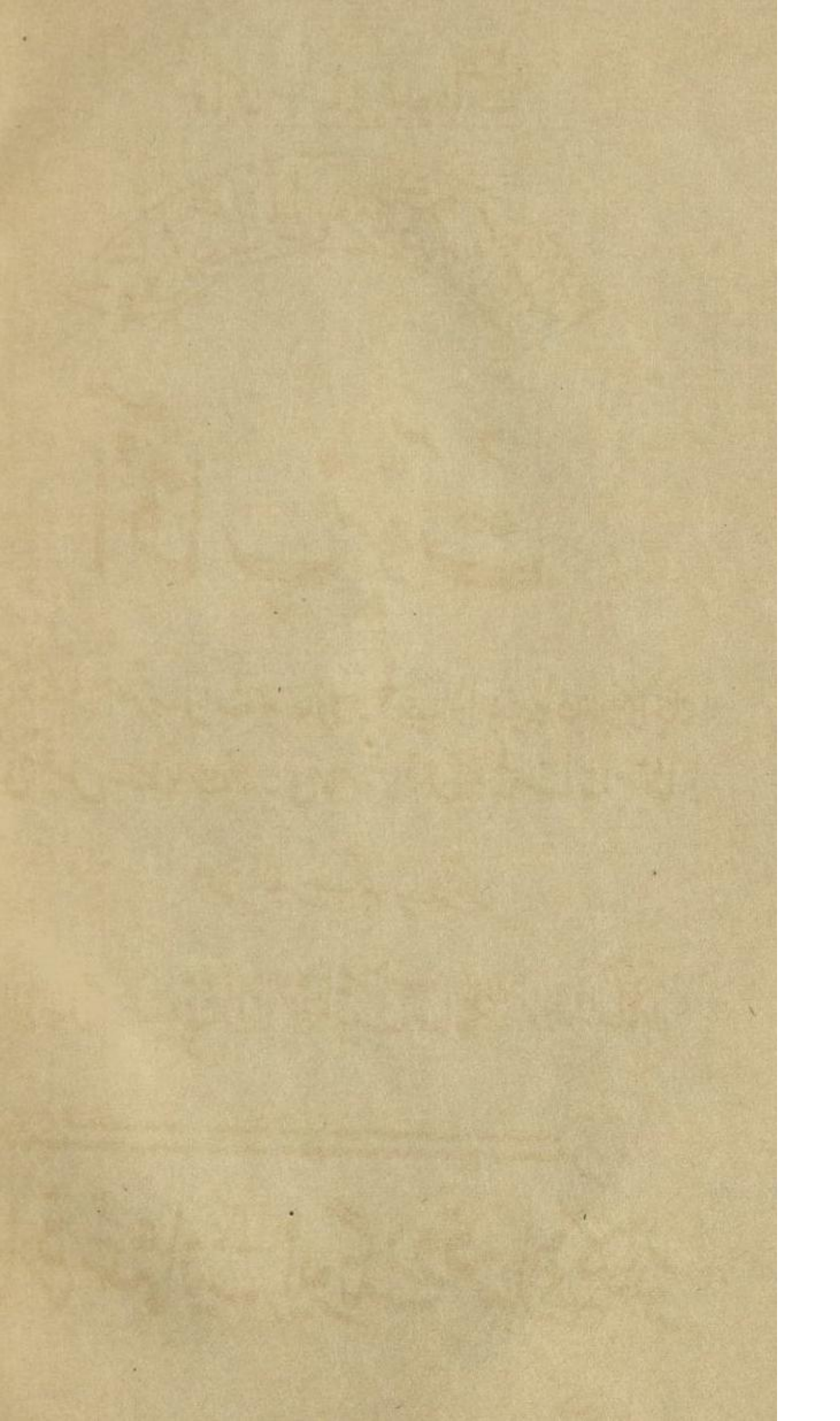
دو ماہی سلسلہ مطبوعات ۲

وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا

آفتاب نبوت (جلد دوم)

قرآن کریم کی صرف ایک آیت وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا
کی قرآنی تمثیل سے نبوت محمدیہ کی تمام شانوں کا حکیمانہ استنباط

از قلم حکمت رقم
حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر
ادارۂ عثمانیہ ۱۲ ایونگ روڈ نیلا گنبد لاہور

دو ماہی پروگرام کی دوسری کتاب آفتاب نبوت (حصہ دوم)

دوسری دو ماہی ——————— مئی ۱۹۶۱ء
قیمت مجلد مع گرد پوش ——————— دو روپے پچیس پیسے
مطبوعہ ——————— نقوش پریس اردو بازار لاہور

باہتمام

جناب قاری افتخار احمد صاحب قیصر عثمانی ناظم ادارہ عثمانیہ ۱۴ ایونگ روڈ لاہور

ضروری بات

معاونین کرام خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں جو آپکے پاس پہنچنے والی وی پی پر درج ہوتا ہے۔ حوالہ نمبر کے بغیر معاونین حضرات کے خطوط کے جوابات میں کارکنان ادارہ کو سخت دشواری پیش آتی ہے اور جواب میں تاخیر لازمی بات بن جاتی ہے۔

براہ کرم حوالہ نمبر کا ضرور خیال رکھیں

منجانب ادارۂ عثمانیہ لاہور

اظہارِ تشکر

الحمدللہ ادارۂ عثمانیہ اچھودؔ مسلمانانِ عالم کی جس نہج پر علمی و عرفانی خدمات انجام دے رہا ہے اس پر پاکستان کی اس صدی کی علمی تاریخ گواہ ہوگی اس تھوڑی سی مدت میں ادارہ نے بفضلِ خدا جو کامیابی اور مقبولیت حاصل کی ہے اس میں جہاں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کے روحانی تصرفات اور اراکین ادارہ کا خلوصِ عمل اور اعتماد کارفرما رہا ہے وہیں ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ ہمارے مخلص معاونین کرام کا تعاون اور ان کی امداد کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہمارے لئے مقامِ شکر ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں ایسے مخلص اور بے غرض معاون فراہم کئے ہیں جن کی انتھک سعی و کوشش سے ادارہ حیرت انگیز ارتقائی تسلسل کے ساتھ کامیابی کی طرف گامزن ہے۔

یوں تو ہمیشہ ہی معاونین کرام نے ادارہ کی ہر آواز پر لبیک کہا ہے لیکن اس مرتبہ ناظمِ ادارہ کی مخصوص اپیل پر ہمارے محترم ممبران نے جس خلوص و تندہی کے ساتھ ادارہ کی ترقیاتی اسکیم میں ہمارے ساتھ معاونت فرمائی ہے اس کیلئے ہم قلب کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ جذباتِ تشکر و تشکر پیش کرتے ہیں اور خدائے قدوس کے حضور میں دعاگو ہیں کہ وہ انھیں ان کی اس بے لوث جد و جہد اور تعاون پر اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

ہمیں امید ہے کہ ادارہ کے جملہ معاونین محترم اپنے اپنے حلقۂ اثر میں کوشش و سعی فرماتے ہوئے اپنے احباب و متعلقین کے سامنے ادارہ کی ناقابلِ فراموش خدمات پیش فرمائیں گے اور دو ماہی پروگرام کے لئے ممبر فراہم فرمائیں گے۔ (ادارہ)

ادارۂ عثمانیہ لاہور

جولائی ۱۹۶۱ء کے اپنے دو ماہی پروگرام میں کتاب

"انسانیت کا امتیاز"

اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے

اس کتاب میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مقام انسانیت کی رفعت و اہمیت اور علم و کمال کا اس کے ساتھ اختصاص جس زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے وہ کسی حالت میں قاری کو اس پر آمادہ نہیں ہونے دیتا کہ شروع کرنے کے بعد کتاب کو درمیان میں چھوڑ سکے اپنی نوعیت کی ایک اچھوتی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ساتھ

کائنات روحانی

بھی ہم جلد ہے جو بذات خود ندرت کی حامل ہے۔ کتاب مع حسین ڈسٹ کور یکجا مجلد ہے۔ مجموعی قیمت عام دو روپیہ چار آنے

حافظ قاری افتخار احمد قیصر عثمانی

مینیجر:- ادارۂ عثمانیہ ۱۴۲ ایونگ روڈ لاہور

فہرست مضامین

ادارۂ عثمانیہ ۱۷۱ ایبونگ روڈ لاہور

پیش لفظ

حسب اعلان ادارہ عثمانیہ لاہور ۱۹۶۱ء کی دوسری
پیش کش "آفتاب نبوت جلد دوم" نذر قارئین کر رہا ہے۔

علوم و معارف اور محاسن و اخلاق کے ہر انتہائی اور تکمیلی مرتبہ کو وہی ذات اقدس اپنے دامن میں لئے ہو سکتی ہے جس کو ختم نبوت و رسالت کے اس عظیم و جلیل منصب پر فائز کیا گیا ہو۔ اس ناقابل انکار حقیقت کی مطمئن کن تصدیق آپ ادارہ عثمانیہ کی زیر نظر یادگار پیش کش کے جامع و مبسوط اور دلائل و براہین سے مزین مضامین عالیہ سے کر سکتے ہیں۔ یہ اسی کتاب کی دوسری جلد ہے جس کی روح پرور اور ایمان افروز مضامین سے آپ کس قدر مستفیض و بہرہ مند ہو چکے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں مزید کچھ تعارفی الفاظ لکھنا اسی لئے غیر ضروری ہے۔ لیکن اعتراف حقیقت کے طور پر صرف اس قدر لکھنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی یہ عظیم اور لاثانی تصنیف ادارہ کی تمام گذشتہ مطبوعات پر ایک واقعی اور خصوصی فوقیت رکھتی ہے۔

ادارہ عثمانیہ لاہور حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کے اس بے نظیر اور لاثانی شاہکار کو اپنے مفید ترین دو ماہی پروگرام کی ایک کڑی بتاتے ہوئے انتہائی فخر محسوس کر رہا ہے۔ یقین ہے کہ محترم قارئین پیش نظر کتاب کے سود مند اور بصیرت افروز مضامین سے پوری طرح مستفیض و مطمئن ہوں گے۔

قاری افتخار احمد قیصر عثمانی
ناظم ادارہ عثمانیہ لاہور

دوامِ ظہور

پھر اسی تمثیل سے حضور کے ان مخصوص اوصاف و مقامات پر روشنی پڑتی ہے جو ذات بابرکات کو ممتاز طریق پر عطا ہوئے مثلاً جس طرح سے کہ عام ستاروں کی ہمہ وقت ضرورت نہیں بلکہ مدتہا مدت بھی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ بعض ستارے سال میں ایک مرتبہ طلوع ہوتے ہیں گویا سال بھر میں اپنا دورہ پورا کرتے ہیں بعضے دس سال میں بعضے سو سال میں بعضے ہزار سال میں یعنی ہزاروں برس میں طلوع ہوتے ہیں جن کے طلوع و غروب کا ہمیں علم بھی نہیں ہوتا، دنیا جانتی بھی نہیں کہ کس ستارے نے کس وقت طلوع کیا اور کب وہ غائب ہو گیا گویا ان کا ظہور وقتی ہوتا ہے اور اس وقت ہی کی مصلحت سے ہوتا ہے۔

نہ ہمہ وقت وہ مصلحت درکار ہوتی ہے نہ ہمہ وقت ان کا ظہور ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہزاروں برس بھی ہماری نگاہوں سے بلکہ خود دہم سے اوجھل رہیں تو ہماری نگاہ اور ہماری اپنی دنیا میں اس سے کوئی نمایاں نقصان نہیں آتا بالفاظ دیگر عالم ان کا زیادہ محتاج نہیں لیکن آفتاب کو دیکھو تو بارہ مہینہ موجود اور چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کر کے روزانہ ہمیں زیارت بھی کراتا ہے نور بھی بخشتا ہے۔ گرمی بھی پہنچاتا ہے۔ اور راستے بھی دکھاتا ہے۔ پھر اگر وہ رات میں نگاہوں سے اوجھل اور غائب بھی ہوتا ہے تو صرف انہی سے جن کی مغرب

میں وہ غروب ہو رہا ہے لیکن وہ خطۂ دنیا سے غائب نہیں ہو جاتا اگر یہاں غروب ہو رہا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہے اور جبکہ زمین کروی ہے تو ہر ہر قدم پر اگر غروب ہے تو ہر ہر قدم پر طلوع بھی ہے۔ اس لئے وہ ہمہ وقت موجود اور فیض رساں ہے۔ اگر کسی بھی خطے سے وہ مقررہ ساعتوں سے زیادہ غائب ہو جائے تو عالم تباہی کے کنارے آ لگے۔ اس لئے وہ ہمہ وقت دنیا اور بنی نوع انسان کے سامنے ہے۔ ورنہ لاکھوں ستارے ہیں کہ اول تو ان کے خصوصی ظہور اور طلوع ہی کا پتہ نہیں چلتا اور چلتا ہے تو عام ستاروں میں مل جل کر ان کا ظہور بھی ہو جاتا ہے جس کا دنیا کو احساس بھی نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح نجوم نبوۃ یعنی انبیاء علیہم السلام کے ظہور کا ایک وقت خاص مقرر تھا کہ وہ دنیا میں تشریف لائے اور اپنے نورانی آثار چھوڑ گئے۔ دس بیس سو پچاس ہزار دو ہزار برس میں ایک نبی کے ظہور کا وقت آیا اور انھوں نے ایک مدت نمایاں رہ کر مخلوق کو راستہ دکھایا لیکن جب غروب ہوئے تو آج ہزاروں نفوس ہیں کہ دنیا ان کے نام نامی تک سے واقف نہیں اور یہ بھی نہیں جانتی کہ دلوں پر ان کے اثرات کیا تھے اور وہ باقی ہیں یا ختم ہو گئے اور نہ ہی دنیا اسکی تمنا ہی کر سکتی ہے کہ وہ اثرات پھر لوٹ آئیں جبکہ وہ اثرات متعارف ہی نہیں اور نہ انکی ضرورت ہی دلوں میں آئی ہوئی ہے۔ لیکن آفتاب نبوت کا ظہور دوامی اور از اول تا آخر ہے یعنی اس کا دورہ بارہ کے بارہ مہینہ کا ہے۔ حتیٰ کہ اس ظاہری ظہور سے پہلے بھی آپ ہی کا علمی ظہور تھا۔ عہد الست میں آفتاب نبوت ہی کے بلیٰ (کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں) کہنے سے سب انبیاء و اولیاء و صلحاء کی

زبانوں پر بلیٰ کا ایمانی کلمہ جاری ہوا جیسا کہ حدیث الست سے نمایاں ہے پھر ہر نبی آپ کی بشارت دیتا ہوا آیا اور حضرت عیسیٰ کی بعثت کا تو بڑا مقصد ہی یہ بشارت دینا تھا جیسا کہ قرآن شاہد ہے پھر اسی ازل میں سب کے آپ کا یہ علمی ظہور دکھلا کر آپ کے ماننے اور اطاعت کا عہد لیا گیا جیسا کہ آیت میثاق سے واضح ہے پھر پیدائش کے وقت رحم مادر میں توحید کے ساتھ آپکی رسالت ماننے کی تجدید کی جاتی ہے اور فرداً فرداً ہر ایک سے وہی عہد لیا جاتا ہے جو اجتماعی طور پر یوم الست میں لیا گیا تھا جیسا کہ روایات حدیث میں موجود ہے۔

پھر دنیا میں ہر نبی نے اس آفتاب نبوت کی بشارت دی اور اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر وہ ان کے سامنے آئیں تو سب ان کی اطاعت کریں جیسا کہ قرآن نے اس میثاق کو کھول کر بیان فرمایا۔ پھر آپ ہی کی یہ قرآنی تعلیم قرون سابقہ کی تمام آسمانی کتابوں میں کام کرتی رہی وانہ لفی زبر الاولین گویا آپ علم و آثار اور اپنے نام اور کام کے لحاظ سے امم و اقوام سابقہ میں ظاہر و نمایاں اور متعارف رہے پھر قبر میں بھی آپ کو یا آپ کی صورت مثالی یا صورت صفاتی کو دکھلا کر پھر اس عہد سابق کے بارہ میں امتحانی سوالات کئے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ برزخ میں بھی آپ کا ظہور ہے۔ پھر عالم حشر میں آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے سب اقوام و امم ہوں گی آپ ہی کی طرف سارے بنی آدم مل کر شفاعت کبریٰ کے لئے رجوع کریں گے جس سے عالم آخرت میں بھی آپ کے ظہور کا صاف پتہ ملتا ہے۔ غرض زمانہ الست سے لیکر رحم مادر دار دنیا، دنیا کے قرون و دہور، عالم برزخ اور عرصات قیامت تک کونسا عالم ہے جس میں آپ کا ظہور نہیں اور وہ بھی ایک ایسے امتیاز کے ساتھ جو اور کسی کو

میسّر نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ آفتاب کی طرح اگر آپ کسی جہان سے کسی وقت غائب بھی ہوتے تو کسی جہان میں علمی ظہور کے ساتھ آپ نمایاں بھی رہے۔ آپ دنیا میں رہے تھے تو عالم غیب میں آپ کے آثار صالحہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور اب عالم آخرت میں ہیں تو عالم دنیا میں آپ علمی ظہور کے ساتھ جلوہ گر ہیں چنانچہ آپ کا عظیم الشان زندہ معجزہ ہی علمی ہے جو قرآن کی صورت میں دنیا پر ضیاء پاشی کر رہا ہے۔ اور اس معجزہ کی زندہ شرح حدیث پاک کی صورت میں جلوہ گر ہے جو سند صحیح اور اعلیٰ تاریخی اصولوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اور پھر اس کتاب و سنت کی زندہ تفصیلات فقہ و تصوف اور کلام وغیرہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کو روشن کئے ہوئے ہیں جو ذوق نبوی کی حامل اور باذوق راسخین فی العلم کے قلوب صافی پر الہام شدہ ہیں۔ اس لئے واسطہ بلاواسطہ آثار نبوت اسی شان سے دنیا میں آج بھی جلوہ پیرائی کر رہے ہیں جس شان سے وہ قرن اول میں ضیاء پاشی کر رہے تھے۔

ہنوز آن ابر رحمت دُرفشان است ✽ خم و خم خانہ با مہر و نشان است

یہ ضیاء افگنی اور علمی ضوء افشانی اتنی کھلی ہوئی ہے کہ ساری دنیا ان اصول و علوم سے زندگی حاصل کر رہی ہے۔ پس یہ آفتاب نبوت گویا اولین و آخرین کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت موجود اور جانا پہچانا ہے جس کے اثرات کو دنیا کھلی آنکھوں محسوس کر رہی ہے۔ حضور کی اس موجودگی یا حیات کو کوئی کور باطن حاضر و ناظر کے معنی میں نہ لے کہ حاضر و ناظر خاصۂ الوہیت ہے۔ مخلوق میں جو ظہور تام باذن اللہ ہو سکتا ہے حضور سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہیں۔ پس آفتاب مادی کی طرح یہ آفتاب روحانی بھی عالم کائنات میں اگر ایک جگہ غائب ہے تو دوسری جگہ حاضر ہے۔

اور جہاں سے غائب ہے وہاں اس کے علمی اثرات قائم رہتے ہیں اس لئے گویا وہاں سے بھی غائب نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر اس کے اثرات عالم سے ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع ہو جائیں تو دنیا کی روحانیت تباہ ہو جائے چنانچہ اگر آج بھی اس عالمی پیغمبر (روحی فداہ) کے عالمگیر اصول سے سرتابی کی جائے تو نہ دنیا کا موجودہ تمدن ہی برقرار رہ سکتا ہے نہ ذہنیت میں وسعت باقی رہ سکتی ہے۔ آفتاب نبوت کا دوامی ظہور اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔

(۵۲) عظمت و شہرت عامہ قبول عام اور پیروئی اقوام

پھر جس طرح سارے ستاروں میں آفتاب ہی سب سے زیادہ رفیع و بلند پُر نور اور بزرگ ترین ستارہ ہے نیز سب ستاروں سے زیادہ جانا پہچانا اور سب سے زیادہ مشہور ہے کہ نہ اس کی شہرت کی حد کو کوئی ستارہ پہنچا ہوا ہے اور نہ رفعت و عظمت ہی اس جیسی رکھتا ہے چنانچہ کتابوں اور کہاوتوں تک میں جو شہرت اس کی ہے وہ کسی ستارہ کی نہیں۔ اکثر و بیشتر ستاروں کے تو نام تک سے بھی دنیا واقف نہیں نہ ان کا کوئی خصوصی ذکر زبانوں اور قلموں پر ہے اور نہ ان کی کوئی یاد ہی دلوں میں ہے۔ اور جن چند ستاروں کے اسماء معلوم بھی ہیں، جیسے زہرہ، مشتری، زحل، مریخ، عطارد وغیرہا تو وہ زیادہ تر جنتریوں کی زینت ہیں خواص و عوام میں سو بہت کم لوگ ہیں جو ان ناموں سے واقفیت رکھتے ہیں، بخلاف سورج کے کہ کوئی فرد بشر اس سے اور اس کے نام سے ناواقف نہیں اور کون ہے جو اس کی صورت زیبا اور سیرت پُر انوار سے باخبر نہ ہو۔ حتیٰ کہ بہت سی قومیں تو اسے معبود کی حیثیت سے

جانتی ہیں، طلوع و غروب کے وقت اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں حتیٰ کہ ابلیس کو بھی صورت معبودیت بنانے کے لئے اسی کی آڑ لینی پڑتی ہے کہ عین طلوع و غروب کے وقت اسی کو سر پر لیکر کھڑا ہوتا ہے تاکہ سجدے کرنے والی قوموں کا سجدہ اپنے حق میں تصور کرکے دل ہی دل میں خوش ہو کہ یا وہ صورۃً ان کا معبود بن گیا ہے اور یا غیر اللہ کی پرستش کرانے میں وہ سورج کی معرفت کامیاب ہو گیا۔ بہرحال ابلیس لعین روسیاہ بدنام کو بھی اپنی نام نہاد بڑائی میں چار چاند لگانے کے لئے سورج کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی اس عمومی شہرت و عظمت اور اس عمومی و خصوصی تعارف کی بنا، بجز اس کے فیضان عام کے اور کیا ہو سکتی ہے کیونکہ فضا اور سطح زمین کا ذرہ ذرہ اس کی تنویر اور تاثیر سے فیضیاب اور اس سے روشنی اور گرمی کا فیضان لئے ہوئے ہے تو عدم تعارف کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

ٹھیک اسی طرح آسمان نبوت کے تمام ستاروں میں آدمؑ سے لیکر حضرت مسیحؑ تک آفتاب نبوت کو جو عظمت و رفعت اور جو شہرت و وجاہت حاصل ہے وہ کسی سیارے کو نہیں۔ ہزارہا نجوم نبوت (انبیاء علیہم السلام) ہیں جن کے اسماء گرامی سے بھی دنیا واقف نہیں ہے جن کا آج کوئی تذکرہ تک نہیں قرآن نے بھی فرمایا۔

فنھم من قصصنا علیك ومنھم من لم نقصص علیك	پس انبیاء میں سے کچھ وہ ہیں جنھیں ہم نے آپ کے سامنے بیان کیا اور کچھ وہ ہیں جنھیں بیان نہیں کیا

قرآن کریم یا کتب تاریخ کی بدولت جن کے اسماء معلوم بھی ہیں جیسے موسیٰ و عیسیٰ، یونس، سلیمان، یعقوب و یوسف، داؤد و شعیب، یحییٰ و زکریا، ارمیاء و

شعیا اور دانیال وغیرہ علیہم السلام، ان کی مکمل تاریخ نامعلوم اور جس حد تک ہے، بھی تو وہ ہر قوم میں یکساں متعارف نہیں۔ کوئی قوم کسی پیغمبر کو جانتی ہے اور کوئی کسی کو کیونکہ کوئی بھی ان میں سے عالمی پیغمبر نہیں تھا اور عالمی پیغام لیکر نہیں آیا تھا کہ پورا عالم اس سے واقف ہوتا اور پوری دنیا پر اس کا فیضان عام ہوجاتا نہ ان میں سے کسی نے سلاطین عالم کو فرامین ہدایت بھیجے نہ کسی نے دنیا کے تمام انسانوں کو خطاب کرکے اپنے پیغام سے آشنا کیا اور نہ وہ پیغام ہی عالمی اسپرٹ اپنے اندر رکھتا تھا کہ ایسا کیا جاتا کیونکہ نجوم ہدایت کا نور محدود اور بلا پھیلاؤ کے ہوتا ہے اس لئے نجوم کا تعارف بھی عمومی نہیں اور رفعت ذکر بھی عام نہیں۔

لیکن آفتاب نبوت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی دنیا کی ہر قوم میں معروف، آپ کی شہرت آسمانوں اور زمینوں میں یکساں، بحر و بر اور صحرا و بیابان میں اذانوں کی آوازیں گونجتی ہیں جن میں اللہ کے نام کے ساتھ نام نامی کا تذکرہ لازم ہے۔ ورفعنا لك ذكرك۔

کوئی جگہ نہیں جہاں آپ کے علوم کی روشنی نہ پہنچی ہو اور کوئی خطہ نہیں جہاں آپ کی اخلاقی تاثیرات و برکات نہ پھیلی ہوں جس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کا فیضان عام پوری دنیا کو پہنچا۔ کیونکہ آپ مقامی پیغمبر نہ تھے بلکہ آپ عالمی پیغمبر اور پورے عالم انسانیت کے مصلح اور مربی تھے آپ کا پیغام کسی ایک قوم یا ایک طبقہ کے لئے خاص نہ تھا بلکہ عمومی تھا شرعی حیثیت سے بھی، تاریخی حیثیت سے بھی اور تمدنی حیثیت سے بھی۔ شرعی طور پر دیکھو تو قرآن نے آپ کو رحمۃ للعلمین، نذیر للعلمین کہا جس سے آپ کا سب جہانوں کے لئے رحمت ہونا اور سارے جہانوں کیلئے

ہادی و نذیر ہونا واضح ہے، پھر ان دونوں اوصاف کے ساتھ آپ کی رسالت کو سارے انسانوں کیلئے بتایا گیا اور کہا گیا۔ اور آپ کی رحمت ممالک دنیا میں پھیلی اور عام ہوئی

وما ارسلناک الا کافۃ الناس بشیرا و نذیرا	اور ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کو ارشاد فرمایا گیا کہ جہانوں کے سارے انسانوں کو خطاب فرمائیں

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعًا۔	آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس لئے روم و شام، مصر و فلسطین، ایران و توران، ہندوستان، یورپ و ایشیا، افریقہ و امریکہ، چین و روس، افغانستان و ترکستان، جاوا و سماٹرا غرض مشرق و مغرب میں آپ کی امت پھیلی اور آپ کا ملک وسیع ہوا۔ تاریخی حیثیت سے دنیا اسے مان چکی ہے کہ آپ عالمی مصلح اور عالمگیر تعلیم لے کر آئے ہیں اور دنیا اس تعلیم کو قبول کرنے پر مجبور بھی ہے۔ جو آپ کی نبوت کو نہیں بھی مانتے وہ بھی آپ کو دنیا کا سب سے بڑا حکیم اور سب سے بڑا دانا اور عاقل ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے تعلیم فرمودہ اصول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔

توحید کامل کا پیغام آپ ہی نے دیا جو مذہب کی جان اور روح رواں ہے اسی توحیدی گونج کا نتیجہ تھا کہ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا جس نے تثلیث سے بیزاری کا اظہار کر کے وحدانیت کا درس قبول کیا۔

انہی توحیدی مواعظ کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں میں آریہ مت کھڑا ہوا جس نے

توحید کا نام لینا شروع کیا۔

انہی توحیدی تعلیمات کا ثمرہ تھا کہ ہندوؤں میں سکھوں کا فرقہ توحید کا نام لیوا بنکر کھڑا ہوا جس کے بانی گرو نانک صاحب نے حضرت بابا فرید شکر گنج سے مستفید ہو کر توحید کی اشاعت شروع کی۔

اسی توحیدی تحریک کا نتیجہ ہے کہ آج بت پرست قومیں بھی بت پرستی کو عیب اور شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ معاشرت کی لائن میں دیکھو تو اونچ نیچ مٹا کر مساوات کا درس آپ نے دیا اور دنیا کی قومیں اس اصول کو اپنانے پر مجبور ہو گئیں، بالخصوص آج کے مشینی دور میں جبکہ پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ بن چکی ہے اور اقوام عالم میں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عالمیت و عمومیت ابھر رہی ہے جس میں مساوات کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اس لئے اونچ نیچ والی قومیں بھی آج اونچ نیچ کو لعنت قرار دینے لگی ہیں نسلی امتیازات کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے یہ درس انہیں کہاں سے ملا؟ بلا شبہ وہیں سے ملا ہے جہاں سے بطور اصول اعلان کیا گیا تھا کہ

۱۔ ان الناس کلھم اخوۃ (حدیث نبوی)	تمام بنی آدم بھائی بھائی ہیں۔
۲۔ یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ (القرآن)	اے انسانو، ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔
۳۔ کلکم بنو آدم و آدم من تراب (حدیث نبوی)	تم تمام اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔

آج ہندوستان کے وزیر اعظم (مسٹر نہرو) اعلان کرتے ہیں کہ اگر عالمیت

چاہتے ہو تو نسلی امتیازات ختم کرو چھوت چھات کی لعنت دور کرو۔ اونچ نیچ مٹاؤ۔ گاندھی جی بھنگی بستی میں ٹھیرتے ہیں اور ہریجنوں کے لئے مندر کھلوانے کا پرچار کرتے ہیں پنتھ جی چماروں کے گھرکے گلاس میں دودھ پیتے ہیں۔ آخرکار چھوت چھات کے دلدادوں کو یہ تعلیم کہاں سے ملی؟ کوڈبل کے پاس کرانے پر آج تعلیم یافتہ ہندو کیوں تلے ہوئے ہیں جو سرتاسر فقہ اسلامی کا چربہ ہے۔ میراث بنات، تعدد ازدواج، طلاق بل، خلع بل وغیرہا کا اسمبلیوں میں کیوں چرچا ہے؟ مسئلہ غلامی کی تحقیر پر آج کیوں نظر ثانی کی جارہی ہے؟

سیاسی لائنوں میں بادشاہت لیڈری کی شکل میں کیوں آرہی ہے؟ گدی نشینی کے بجائے انتخاب اصلح کا اصول کیوں جاری ہو رہا ہے؟ شخصی استبداد کے بجائے رائے عامہ کی اہمیت کیوں پیدا ہو رہی ہے جس سے امراء و سلاطین ہمیشہ گریزاں اور متنفر رہتے تھے۔ تنگدلی کے بجائے رواداری کا درس آج کس نے دیا ہے، تعصب کو بری نگاہوں سے کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ جو ابتک بقاء قومی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا تھا۔ آج اسٹیجوں پر دوسروں کے مقتداؤں کی تعریف وہ لوگ کیوں کرنے لگے ہیں جن کی مذہبی بنیادیں ہی مقتدایان مذاہب کی تحقیر پر قائم تھیں جن کے یہاں مذہب تکذیب غیر کا نام تھا نہ کہ تصدیق غیر کا۔ آج یہ نفرت کی بنیادیں کیوں بری سمجھی جارہی ہیں اور انھیں فرقہ واریت بتا کر ان کے مقابلہ میں بین الاقوامی موانست کا پرچار کیوں کیا جارہا ہے؟ یہ بلاشبہ صرف اسی آفتاب نبوت کی روشن تعلیمات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہونے کا ثمرہ ہے جس نے عالمیت کیطرف

دنیا کو بلایا۔ سب مقتدایان مذاہب پر ایمان لانا سکھلایا۔ جس نے ایمان کے سلسلہ میں تفریق بین الرسل کو ممنوع قرار دیا۔ سارے انسانوں کو بھائی بھائی کہا۔ ساری دنیا کو پیغام امن و سلامتی دیا۔ سارے انسانوں کو بلا تفریق نسل و رنگ ایک ذات واحد کی طرف بلایا۔ اور اس پر جمع کر دیا۔ ساری اقوام کو قوم واحد بنانے کا اصول رکھا۔ سلاطین عالم کو فرامین بھیجے۔ قیصر و کسریٰ کی جابرانہ اور مستبدانہ سیاستوں کو الٹ کر اخلاقی سیاست پھیلائی۔ پوری دنیا میں اپنے نقیب بھیجکر پیغام فطرۃ پہنچایا جو ہر قوم کے لئے یکساں قابل قبول تھا۔

یہی وہ عالمگیر فیض رسانی تھی جس سے آپ کی مقبولیت عالمگیر شہرت و عظمت عالمگیر اور معرفت و پہچان عالمگیر ہوئی جیسا کہ ستاروں میں آفتاب کی ہے۔ بس دنیا اور انبیاء کے ناموں تک سے واقف نہیں کہ ان کی روشنی پھیلتی ہوئی روشنی نہ تھی لیکن آپ کی تعلیمات آفتاب کی دھوپ کی مانند تھیں جنھوں نے دن بھی کر دیا اور ذرہ ذرہ پر پھیل کر ہر فرد بشر کے سامنے اپنے کو خود روشناس کرا دیا۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ آفتاب نبوت کو پورا عالم جان نہ جاتا اور پہچان نہ لیتا نیز سارے نجوم نبوت میں اس کی یہ امتیازی معرفت و پہچان عام نہ ہو جاتی۔

جامعیت شئون | پھر آفتاب میں جہاں جامعیت کی شان بھی موجود ہے وہ جلاتا بھی ہے اور بجھاتا بھی ہے اس میں سوز و تپش بھی ہے اور خنکی و برودت بھی ہے جلال بھی ہے اور جمال بھی ہے۔ کیونکہ اس مادی آسمان پر جب سورج طلوع کرتا ہے تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بے تحاشا گرمی برسنے لگتی ہے جس سے اشیا تپ جاتی ہیں اور سوختہ ہو جاتی ہیں اور اسی آسمان پر چاند بھی طلوع کرتا ہے جس سے ٹھنڈک

برسنے لگتی ہے اور چیزیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں اگر سورج کی گرمی نہ برسے تو اشیاء میں حرارت غریزی نہ رہے جو نشار حیات ہے اور اگر چاند کی ٹھنڈک نہ برسے تو پھلوں میں رس گٹھلیوں میں گودا اور چھلکوں میں مغز پیدا نہ ہو جو شئے کی زندگی کی بنیاد ہے۔

چنانچہ ہڈیاں اگر خشک ہو جائیں پھل رس نہ رہنے کی وجہ سے سوکھ جائیں اور چھلکے مغز کو کھو کر خشکی سے سکڑ جائیں تو یہی ان کی فنا ہے جس سے واضح ہے کہ جہاں اشیاء کے لئے خشکی کی ضرورت ہے وہیں تری کی بھی حاجت ہے اور یہ دونوں چیزیں آسمان نے جمع کر رکھی ہیں خشکی کو سورج لاتا ہے اور تری کو چاند لیکن غور کرو تو یہ تری بھی سورج ہی لاتا ہے کیونکہ چاند میں خود اپنی کوئی روشنی نہیں وہ تو ایک شفاف آئینہ کی طرح ہے جس کی چمک دمک اور نورانیت سب آفتاب کا فیض ہے۔ اس لئے چاند میں درحقیقت آفتاب ہی کا نور ہے فرق اتنا ہے کہ خود چاند کے ظرف میں کچھ ٹھنڈک کی خاصیتیں رکھدی گئی ہیں جس سے سورج کا نور اس پر پہنچکر رنگ بھی بدلدیتا ہے۔ اس کی تیزی اور خیزگی بھی باقی نہیں رہتی اور تپش بھی تبدیل ہو جاتی ہے کہ شعلہ باری باقی نہیں رہتی اور روشنی کا نام بھی بدلدیا ہے کہ دھوپ کے بجائے اسے چاندنی کہنے لگتے ہیں لیکن ہوتا ہے وہ سورج ہی کا نور پس چاند کی ٹھنڈی روشنی درحقیقت سورج ہی کی روشنی ہے جو مقام کی خصوصیات سے کچھ تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے بجلی کو ہیٹر میں دوڑا دیا جائے تو کمرے گرم ہو جاتے ہیں۔ اور اسی بجلی کو ائرکنڈیشن کے طور پر اس کی مشین میں دوڑا دیا جائے تو کمرے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پس بجلی کی اصل تو درحقیقت ناریت اور تیزی ہے لیکن ائرکنڈیشن کے راستے سے اسے لایا جائے تو وہی تیزی اور گرمی ٹھنڈک

میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو مشین اور اس کے ظرف کی خاصیت ہوتی ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ بجلی کی آگ جلانے اور بجھانے کے دونوں کام کرتی ہے صرف ظرف کی خصوصیات بدلتی ہیں بجلی نہیں بدلتی ٹھیک اسی طرح سورج کے نور میں بھی گرمی اور جو چاند کے ظرف کی خصوصیت ہے ٹھنڈک، دونوں کی خاصیتیں موجود ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ گرمی بلا واسطہ ہے جو سورج کی اصل خاصیت ہے۔ اور ٹھنڈک، بواسطۂ چاند ہے جو چاند کے ظرف کی خصوصیت ہے، مگر نور، دونوں جگہ سورج ہی کا کام کرتا ہے اس لئے ان دونوں حالتوں کو سورج ہی کی شانیں کہا جائیگا کہ وہ جلاتا بھی ہے اور بجھاتا بھی ہے، گرماتا بھی ہے اور ٹھنڈا بھی ہے، صرف واسطہ اور بلا واسطہ کا فرق ہے لیکن اگر نگاہوں کو اور گہرا لیجایا جائے تو واضح ہوگا کہ چاند کے واسطے کے بغیر بھی سورج میں یہ گرمی اور ٹھنڈک دونوں بیک آن جمع ہیں۔ کیونکہ سورج جہاں سمندروں کو تپاتا ہے جس کا کام ہی جلانا اور تپانا ہے وہیں اس تپش سے ان میں ابخرات بھی اٹھاتا ہے جو مانسون لیکر ٹھنڈا پانی دنیا پر برساتے ہیں جس سے گرمیاں بجھتی چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ سورج ہی کا فیض ہوتا ہے وہ نہ ہو تو سمندروں میں بخارات بھی نہ اٹھیں، مانسون بھی نہ بنے اور ٹھنڈے پانی سے دنیا محروم ہو جائے۔ اس سے نمایاں ہے کہ سورج ایک ہی وقت میں سمندروں میں تپش اور ٹھنڈک کے دونوں سامان پیدا کرتا ہے۔ پھر بحر ہی میں نہیں برّ میں بھی یہ دونوں کیفیات سورج ہی کی ذات سے نمایاں ہوتی ہیں بعین گرمی کے شدید موسم میں جس آن سورج زمین کی سطح کو تپاتا ہے اس آن زمین کے اندرونی حصہ کو ٹھنڈا بھی بخشتا ہے۔ چنانچہ اوپر کی گرمی جتنی شدید ہوتی ہے اندرونی ٹھنڈک اسی حد

تک بڑھ جاتی ہے۔ گرمیوں میں پانی تک زمین کے اندر سے ٹھنڈا نکلتا ہے۔ لیکن سردی کے موسم میں اس کا عکس ہوتا ہے، یہی آفتاب جب زمین کے اوپر کے حصہ کو گرمی کم دیتا ہے گویا اس میں ٹھنڈک ملا دیتا ہے تو زیر زمین گرمی بڑھا دیتا ہے حتیٰ کہ سردیوں میں پانی بھی زمین کے اندر سے گرم نکلنے لگتا ہے، تہ خانے بھی گرم ہو جاتے ہیں اس سے صاف نمایاں ہے کہ سورج چاند کے واسطے کے بغیر بھی سردی و گرمی اور حرارت و برودت کی دونوں شانیں اپنے اندر ملی جلی لئے ہوئے ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جامعیت اضداد اس کی خاص شان ہے اگر گرمی میں یہ زمین کی ذاتی ٹھنڈک تھی تو سردیوں میں یہ ذاتی وصف کہاں گم ہو جاتا ہے اور کیوں ہو جاتا ہے اور اگر زمین کے اندر کی گرمی اصل اور ذاتی ہے تو گرمی میں وہ کیوں زائل ہو جاتی ہے۔ اور اگر زمین کی یہ سردی گرمی ذاتی نہیں بلکہ آفتاب کا اثر ہے تو یہی ہمارا مدعا ہے جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ سورج بحر و بر میں گرمی و خنکی دونوں کے آثار نمایاں کرتا ہے۔ ٹھیک، اسی طرح آفتاب نبوت بھی جلال و جمال، نرمی و گرمی، مہر و قہر دونوں شانیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے جس سے اس کا کمال اعتدال ثابت ہوتا ہے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف رحمت مجسم ہیں تو دوسری طرف غضب مجسم بھی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے۔

بعثت مرحمۃ وملحمۃ — میں رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور غضب مجسم بنا کر بھی۔

اور فرمایا گیا۔

انا الضحوک القتال۔ — میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور بہت جنگی بھی ہوں

چنانچہ ایک طرف آپ کی شریعت میں عفو و درگذر۔ نفی جرم۔ عذر پذیری بسالحۃ چشم پوشی انتہائی ہے جو مہر کی شان ہے۔ اور دوسری طرف حدود و قصاص، سزا و تعزیر، جہاد و قتال اور کفارات بھی مکمل پیمانہ پر ہیں جو قہر و سیاست کی شان ہے پس جیسے اس آفتاب روحانی کی روشنی سے مہر و رحمت ٹپکتی ہے ویسے ہی قہر و سیاست بھی چھنتی ہے اور جیسے وہ جمال کا مصدر ہے ویسے ہی جلال کا مظہر اتم بھی ہے۔

اسی لئے اس روحانی آفتاب کو "سراج منیر" فرمایا گیا "سراج" کے لفظ سے جلال و قہر اور گرمی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور "منیر" کے لفظ سے ٹھنڈک اور جمالی شان کا پس لفظ سراج سے گویا نذیر للعٰلمین کی شان نمایاں ہے اور منیر کے لفظ سے رحمۃ للعٰلمین کی شان واضح ہے اور یہ دیانت و سیاست کے دونوں نور ایک ہی ذات میں جمع کرائے گئے ہیں ایک طرف حکم ہے

خذ العفو وأمر بالعرف و اعرض عن الجاهلين۔ — آپ عفو اور درگذر اختیار کریں۔ بھلائی کا حکم کریں اور جاہلوں سے اعراض کریں۔

اور دوسری طرف حکم ہے۔

يا ايها النبي جاهد الكفار و المنافقين واغلظ عليهم — اے نبی صلعم مخالفین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

ایک طرف فتح مکہ کے وقت مکہ میں آپ لشکر جرار کے ساتھ مسلح داخل ہوتے ہیں جو قہر و سیاست کی شان ہے۔ اور اسی آن تواضع اور خاکساری اور شفقت کا یہ عالم ہے کہ شدت تواضع سے گردن جھکی ہوئی ہے حتیٰ کہ اونٹ کی گردن کے قریب سر مبارک آیا ہوا ہے اور امن عام کا اعلان فرماتے جاتے ہیں۔ پس انذار بھی ہے اور تبشیر بھی مہر بھی ہے اور قہر بھی، دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، فقیری بھی ہے

اور شاہی بھی، آپ ہی کی روحانی قوتیں جب صدیق اکبر میں سے ہو کر گذرتی ہیں تو وہ رحمت محضہ اور جمالی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں اور وہی قوتیں جب فاروق اعظم میں سے گذرتی ہیں تو جلالی اور سیاسی شان اختیار کر لیتی ہیں مگر دونوں میں نور ایک ہی آفتاب کا کارفرما تھا۔ غرض اس آفتاب نبوت اور سراج منیر میں نرمی و گرمی دونوں بیک وقت ملی جلی قائم ہیں۔ پس جیسے سورج کی تشبیہ سے آفتاب نبوت میں اجتماعیت کبریٰ کی شان ثابت ہوئی تھی ویسے ہی اُس تشبیہ سے اس میں جامعیت جلال و جمال کی شان بھی ہویدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک ذات میں دونوں متضاد کمال جمع دکھائی دیتے ہیں ورنہ پہلی امتوں میں یہ دونوں شانیں الگ الگ رہتی تھیں، انبیاء شرعی احکام دیتے تھے اور سلاطین و ملوک ان کا نفاذ کرتے تھے یعنی دین اور سیاست دو طبقوں میں الگ الگ منقسم تھے گویا اس وقت کا دین مادی قوت و شوکت برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت کی قومیں مزاج کی شدید قوتوں کے لحاظ سے قوی تر اور نفسانی قویٰ کے لحاظ سے شدید تر تھیں انھیں دین پر لانے کے لئے اس درجہ یکسوئی اور ترک دنیا کی ضرورت تھی کہ اس کی ساتھ دنیوی جاہ و جلال اور تاج و تخت کسی طرح جمع نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر جمع کئے جاتے تو ان کی شدید نفسانی قوتیں اس کر و فر سے نفسانی جذبات ہی کی طرف مائل ہو کر رہ جاتی۔ اور روحانیت کا کوئی شمہ ان میں قائم نہ ہوتا پس انبیاء کا گروہ تو ان کے دلوں میں ترک دنیا کے مجاہدہ سے دین اور خدا ترسی پیدا کرتا تھا اور ان کی سرپرستی میں ملوک و سلاطین کا گروہ سیاسی قوت سے اس دین کو نافذ کرتا تھا۔ تب اقوام کا دین خالص ہوتا تھا۔ اس پر بھی عام قومیں دین اور روحانیت پر نہ آسکیں اور انبیاء کا مقابلہ کر کر کے ہلاک ہو گئیں۔ مگر امت مسلمہ آخری

امت تھی، قدیم دنیا کے منقسم جلال و جمال کا ردّ عمل دیکھ دیکھ کر اس کے قویٰ میں
کمال اعتدال آچکا تھا اور جامعیت کی استعداد پیدا ہو چکی تھی اس لئے اسے
نبوت اور شریعت جامع دیدی گئیں اور ایک ہی ذات بابرکات (آفتاب نبوت)
میں یہ جلال و جمال کی دونوں شانیں رکھدی گئیں جس سے دیانت میں سیاست
اور روحانیت کے ساتھ ملوکیت مخلوط ہوئی۔ اس طرح الملک والدین
توامان (ملک اور دین دو جوڑواں بچے ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں
کیا جا سکتا) کا ظہور ہوا گویا امم سابقہ میں ان دونوں چیزوں کی جدائی امتوں
کے ضعف استعداد کے سبب سے تھی اصل حقیقت نہ تھی یہ ضرور ہوا کہ بعض
انبیاء علیہم السلام کو جہاد کا حکم دیا گیا اور ملک کا کوئی خاص حصہ فتح کرنے پر
مامور فرمایا گیا لیکن بعد از فتح پھر وہی دیانت و سیاست کی تقسیم ہوتی رہی صرف
اسلام میں جہاد اور فتح کے بعد دین و ملک جمع کر دئے گئے تھے جو ان کی اصلیت
تھی، اس سے آفتاب نبوت کی شان جامعیت اسی تمثیل سے نمایاں ہو جاتی
ہے جو بہت سی شرعی نص کا مصداق ہے۔

جامعیت احوال پھر اسی جامعیت کا ایک اور نمونہ اور ایک دوسرا پہلو بھی
اسی تمثیل سے کھلتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آفتاب ہی کی ایک اور خصوصیت پر نگاہ
ڈالنے سے نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے دو رُخ ہیں۔ ایک طرف تو وہ ہر آن دنیا
کو نور و حرارت اور روشنی بخشتا رہتا ہے کوئی ایک لمحہ اس سے فارغ نہیں کہ اس
سے نور و حرارت دنیا کو ملنا بند ہو جائے۔ عناصر و موالید کو گرمانا اور روشن
کرنا ہر ایک کے گھر پر روشنی و گرمی ڈالنا بیماروں کی طبیعتوں میں گرمی اور روشنی

بھرنا تندرستوں میں حرارت غریزی کو ابھارنا پھر اس روشنی اور گرمی سے دنیا کے کام کاج میں اعانت کرنا جیسے مسافروں کے سفر کی تکمیل جو بلا روشنی کے نہیں ہو سکتی معاش کی تکمیل جو بغیر روشنی کے نہیں ہو سکتی آتشگیر مادوں میں آتشیں مادے بھرنا۔ وہ طلوع نہ کرے تو کسی بھی آتشگیر مادے اور آتشدان ظرف میں آتشیں اثرات کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ نہ چقماق سے شرارہ بلند ہو نہ لوہے سے چنگاری پیدا ہو نہ پتھر سے آگ نکلے۔ نہ پانی سے بجلی بنے، نہ سمندر سے مان سون اٹھے، نہ رطوبات فاسدہ خشک ہوں، نہ مرطوب مزاجوں میں اعتدال پیدا ہو جس سے واضح ہے کہ سورج کا ایک ایک لمحہ تمام اشیاء کائنات کو فیض رسانی میں مشغول ہے جسے خدمت خلق کا عنوان دیا جانا غیر موزوں نہ ہوگا۔

لیکن خدمت خلق کے ساتھ ساتھ اگر اس کے دوسرے حال پر نظر کیجائے تو نظر آتا ہے کہ اس کا کوئی لمحہ عبادت رب سے بھی فارغ نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ

كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم في المسجد عند غروب الشمس فقال يا ابا ذر اتدري اين تذهب هذه الشمس؟ قلت الله ورسوله اعلم قال تذهب لتسجد فتستأذن فيؤذن لها في الرجوع كما جاء

میں ایک دن مغرب کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتھ مسجد میں تھا حضور نے مجھ سے فرمایا اے ابوذر جانتے ہو یہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس عرش کے پاس چلا جاتا ہے سجدہ کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے۔ پس جس طرح آیا تھا اسی طرح جانے کی

(کما فی روایۃ الترمذی واحمد) | اجازت مل جاتی ہے
وبوشک ان تسجد فلا یوذن | اور قریب ہے کہ سجدہ کرے اجازت نہ ملے
لہا فیقال لہا ارجعی من حیث | اور کہا جائے کہ جہاں سے آئے وہیں واپس جا واپس
جئت فتطلع من مغربہا فذلک | یہی وہ قیامت کا قرب ہوگا) کہ سورج مغرب
قولہ عزوجل والشمس تجری | سے طلوع کرے گا۔ بس یہی معنی ہیں اللہ
لمستقر لہا۔ | تعالیٰ کے قول "والشمس تجری لمستقر لہا" کے

مراد حدیث متعین کرنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ زمین گول ہے جیسا کہ اپنی جگہ ثابت شدہ ہے اور آفتاب اس کے ارد گرد گردش میں ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر آن کہیں طلوع ہے اور کہیں غروب گویا ہر لمحہ وہ طلوع بھی کرتا ہے اور غروب بھی ہوتا ہے۔ اور جبکہ ہر غروب کے بعد سجدہ کر کے نئے طلوع کی اجازت چاہتا ہے تو نتیجہ صاف یہ نکلا کہ وہ ہر آن سجدے کرتا ہوا چلتا ہے۔ پس جس طرح وہ اس چال سے ہر لمحہ اشیاء کو نور اور گرمی بخشتا ہے اسی طرح اس چال میں ہر لمحہ سجدے بھی کرتا ہے جسے عبادت رب کہنا چاہئے۔ گویا سورج کا ایک ایک لمحہ خدمت خلق اور عبادت رب دونوں میں یکساں مشغول ہے نہ خدمت خلق سے عبادت اسے مشغول کرتی ہے اور نہ عبادت رب سے خدمت خلق میں فرق آتا ہے جس سے سورج کی جامعیت احوال واضح ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب کی بھی کہ ادھر تو شب و روز مخلوق خدا کی تربیت اور انھیں علم کی روشنی اور عشق الٰہی کی گرمی پہنچانا جس سے ایک منٹ فارغ نہیں تھا کیونکہ آپ کی پوری زندگی کو اسوہ حسنہ کہا گیا ہے جس کا ایک ایک لمحہ

دین اور شریعت ہے وہ قول ہو یا عمل۔ عادت ہو یا عبادت ہر ایک میں نمونۂ عمل اور ذخیرۂ اتباع و پیروی موجود ہے۔ آپ کا سونا ہو یا جاگنا سب نمونۂ شریعت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع دین ہی ہے دنیا میں نہیں اس لئے آپ کی پوری زندگی اور زندگی کا ایک ایک حرکت و سکون دین بخشنے والا ہے جس کی تعبیر دوسرے لفظوں میں یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کا ہر ہر لمحہ خدمت خلق اور تربیت مخلوق میں مصروف تھا لیکن اسی کے ساتھ آپ کا کوئی لمحہ یاد الٰہی اور ذکر خداوندی سے بھی فارغ نہ تھا۔ صریح حدیث میں ہے۔

کان یذکر اللہ علیٰ کل احیانہ	آپ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے اور ہر وقت
کان دائم الفکرۃ حزینًا۔	مستغرق اور حزین رہتے تھے۔

ہر لمحہ ذکر الٰہی میں اور ہر ہر دقیقہ فکر میں مشغول تھا کوئی گھڑی ذکر و فکر سے خالی نہ تھی، اور سونے اور جاگنے کا کوئی عمل نہ تھا جس میں اخلاص کامل و رجوع کامل کی روح دوڑی ہوئی نہ ہو۔ پس وہی ساری زندگی جو خدمت خلق میں لگی ہوئی تھی وہی پوری کی پوری عبادت رب میں بھی مشغول تھی کہ لوجہ اللہ تھی اس لئے ہر آن آپ شفقت علیٰ خلق اللہ میں بھی مشغول تھے اور ہر آن تعظیم لامر اللہ میں بھی لگے ہوئے تھے نہ خدمت خلق سے عبادت غافل بنا سکتی تھی نہ عبادت رب سے خدمت غافل کر سکتی تھی۔ اس لئے آفتاب نبوت کی جامعیت احوال بھی اسی آفتاب مادی کی تمثیل سے واضح ہو گئی۔

رحمت مطلقہ پھر جیسے سورج کے لئے طلوع و غروب رکھا گیا طلوع سے وہ سامنے آجاتا ہے اور غروب سے پردہ کر لیتا ہے نہ ہر وقت موجود نہ ہر وقت

غائب کیونکہ اس کی ہمہ وقت کی موجودگی بھی دنیا کے لئے باعث تباہی ہوتی۔ عدم تحمل کی وجہ سے، اور اس کی ہمہ وقت کی غیبت بھی دنیا کی بربادی کا باعث ہوتی انقطاع حرارت کی وجہ سے، اس لئے اس کا ظہور بھی نافع ہے اور خفا بھی مفید۔ اور دونوں ہی عالم کے لئے ضروری۔ ظہور سے دنیا خود اس سے نور لیتی ہے اور اس کی استفادی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اور اس کے خفا سے دنیا اپنے ان نور افگن اجزاء سے افادہ کرتی ہے جن میں آفتاب کے فیض سے نور افگنی کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور دنیا میں نئی نئی قسم کی روشنیاں اور گرمیاں نمودار ہوتی ہیں جس سے دنیا کی افادی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کا دور بھی ظہور و خفا پر مشتمل رکھا گیا اس کے ظہور سے دنیا نے اس سے علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حاصل کی اپنے سینوں کو روشن کیا جس سے خالق و مخلوق کو اور ان کے فرق کو پہچانا اپنا علم و عقیدہ درست کیا اور اس سے اپنا صحیح انجام اس میں دیکھا اور اس طرح روحانیت کا کارخانہ جاری ہوا جس سے انسان کی اپنی روحانی زندگی کی تکمیل ہوئی ظاہر ہے کہ طلوع آفتاب کے بغیر یہ ہدایت کی روشنی کسی طرح بھی نمایاں نہ ہوتی اور انسان ظلم و جہالت کی تاریکیوں میں پڑا رہ جاتا جس سے ظاہر ہے کہ آفتاب نبوت کا طلوع عالم کے لئے ایک مستقل رحمت اور نعمت ہے۔ انا رحمۃ مھداۃ میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ (عالم انسانیت) کو دی گئی ہے۔

لیکن غور کرو تو آفتاب نبوت کا غروب اور پردہ کر لینا بھی کچھ کم رحمت نہیں کیونکہ جیسے مادی آفتاب کے غروب کے بعد ہی لوگ جد و جہد کرتے ہیں کہ آفتاب کی بخشی ہوئی روشنی و گرمی جس جس مادہ میں بھی موجود ہے اس سے نکال کر دنیا میں چلتا

کریں تو ان کی قوت ایجاد چراغ۔ لالٹین۔ گیس لیمپ بجلی اور قمقمے دیا سلائی اور چقماق اور ٹارچ وغیرہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور رنگ برنگ کی روشنیاں دنیا میں نمودار ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی قوت ایجاد بروئے کار نہ آتی اور اس کی یہ ایجادی صلاحیتیں پردۂ عدم میں مستور پڑی رہ جاتی۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب یا اس کی موجودگی میں اس سے یہ حسی اور مکانی جدائی بھی اللہ کی ایک عظیم نعمت اور رحمت ثابت ہوئی۔ آفتاب نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی جبکہ دنیا اندھیر ہوگئی ان وارثان نبوت میں جو روشنی لبفیض نبوت آئی تھی اس کے ظہور کا وقت آیا۔ اور جس جس فرد میں اس آفتاب روحانی کی کوئی کرن پیوست تھی اس سے استنباط کر کرکے حوادث میں اس نے راہ نکالی نئے نئے مسائل رونما ہوئے۔ اور لاکھوں وہ علوم و معارف جو نور نبوت کی شکنوں میں لپٹے ہوئے تھے شکنیں کھولنے کے بعد ظاہر ہونے شروع ہوئے جس سے دین ایک مرتب گلدستہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ اگر آفتاب نبوت یہ ظاہری پردہ نہ کر لیتا تو کس کی مجال تھی کہ اس کے روبرو کوئی اپنے اجتہاد و استنباط سے کام لیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ امت کی اجتہادی صلاحیتیں کبھی بھی بروئے کار نہ آتیں پس مادی آفتاب کے غروب سے جیسے کائناتی مادوں کی نور بخشی کی ایجادی صلاحیتیں کھلتی ہیں ایسے ہی روحانی آفتاب کے غروب سے روحانی مادوں کی علم بخشی کی اجتہادی صلاحیتیں کھلیں پس طلوع سے اگر نور گیری کی قوتیں کھلیں تو غروب سے نور بخشی کی صلاحیتیں نمودار ہوئیں۔ ایک سے استفادہ کی قوت نمایاں ہوئی اور ایک سے افادہ کی۔ گو ان دونوں حالتوں میں نور آفتاب ہی کا ہوتا ہے جو ضیا بخش ثابت ہوتا ہے مگر طلوع میں بلا واسطہ

اور غروب میں بالواسطہ پس طلوع سے نبوت کا نور نمایاں ہوا۔ اور غروب سے ولایت کا۔ طلوع سے تقلید و اتباع کا رنگ کھلا اور غروب سے اجتہاد و استنباط کا جو بالواسطہ وہی نور بنور نبوت ہے۔ صرف ظرف کی خصوصیات اس میں لگ جاتی ہیں۔ اس لئے وہ رنگ برنگ ہو جاتا ہے۔ سو جیسے نبوت کی شانیں خود رنگ برنگ ہیں اسی طرح ان کے مظاہر بھی رنگ برنگ ہونے ضروری تھے اس لئے نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی صدیقیت، فاروقیت، امامت اور اولوالامری کی استنباطی قوتیں نمایاں ہونی ممکن تھیں۔ اس لئے غروب آفتاب نبوت بھی ایک مستقل نعمت اور رحمت ثابت ہوا۔ اور اس طرح ذات بابرکات نبوی اسی تمثیل سے رحمت مطلقہ بھی ثابت ہوئی۔ انا رحمۃ مهداۃ۔

ادھر یہ ظہور و غیبت اور حضور و شہود خود آپ کی ذات بابرکات کے حق میں ہر لمحہ ترقی مدارج کا ذریعہ تھا۔ ظہور اور شہود کے وقت تو تعلیم و تربیت اور تنویرہ تاثیر سے آپ سب کے سامنے ہوتے تھے۔ اور ہر لمحہ ترقی درجات تھی۔ اور غیبت کے وقت جبکہ غیبت تامہ ہوتی تھی جیسے مثلاً نزول وحی کے وقت فنائیت کاملہ کا غلبہ ہوتا تھا اور غیبت تامہ ہوتی تھی کہ نہ آپ کسی کے پاس ہوتے تھے نہ آپ کے پاس کوئی ہوتا تھا۔ یا حسی طور پر جیسے شب معراج میں آپ سب سے اوجھل تھے تو اس میں بلاواسطہ ترقی درجات ہوتی تھی پس شہود میں ترقی بواسطہ تعلیم و تربیت و خدمت خلق تھی اور غیبت میں ترقی بلاواسطہ تھی اس لئے آفتاب نبوت کا یہ ظہور و خفاء خود آفتاب نبوت کے حق میں بھی ہر لمحہ رحمت کاملہ ثابت ہوا۔

پختگی اور تکمیل پھر جیسے آسمانی ستارے جڑی بوٹیوں میں رس ضرور بھر دیتے ہیں۔

نلیوں میں گدا ضرور پیدا کر دیتے ہیں لیکن انھیں پکا نہیں سکتے پختگی صرف آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے جس سے جڑی بوٹیوں کا رس حد کمال کو پہونچتا ہے اور ہڈی کی نلکیوں میں گدا پختہ ہو کر بدن کی جان بن جاتا ہے۔ اگر آفتاب اپنی حرارت سے ان مغزوں کو نہ پکائے اور وہ بہتے ہوئے سیال مادے رہ جائیں تو کسی بدن میں جان اور توانائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت (انبیائے سابقین نے قلوب اور دماغوں میں ایمانوں کا رس ضرور بھرا اور دین کے مغز کو ان کے ظرفوں میں بھرتے بھی رہے۔ مگر دین کی پختگی اور تکمیل آفتاب نبوت کے بغیر ناممکن تھی البتہ امم سابقہ میں تو پختگی کی صورت یہ تھی کہ علوم خاتم النبیین ان کے صحیفوں میں کارفرما تھے۔ وانہ لفی زبر الاولین (اور اسی قرآن کی روح پچھلوں کی کتابوں میں موجود تھی) اور اس طرح انبیاء کی ہنگامی تعلیمات کے خاکوں میں یہ قرآنی علوم و معارف اپنا رنگ بھرتے تھے جس سے تعلیم و تربیت میں پختگی کی صورت پیدا ہو جاتی تھی اور ہر امت محمدیہ میں اس کے برعکس علوم سابقین تو بواسطہ حضرت خاتم النبیین موجود تھے اور علوم نبوی براہ راست کارفرما ہوئے۔ اس لئے امم سابقہ اور امت مرحومہ سب کے لئے پختگی کا سبب آفتاب نبوت ہی ہوا یا دوسرے رنگ سے یہ حقیقت یوں ادا کی جائے گی کہ پختگی کا مطلب دین کی تکمیل کا ہے اور تکمیل کے معنی از سر نو ایجاد کے نہیں بلکہ ایجاد شدہ کو حد کمال تک پہنچانے کے ہیں پس وہ دین جو آدم سے چلا تھا اور تکمیل کی طرف درجہ بدرجہ بڑھ رہا تھا اس کی تکمیل آخر کار حضرت خاتم النبیین علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی کہ خاتم کے کامل ترین علوم کے بغیر یہ تکمیل وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پس آفتاب روحانی نے دین سابق کو اپنی جامعیت کبریٰ کے راستہ سے بلحاظ اصول و فروع حد کمال کو پہنچایا۔ دلائل قاہرہ اور معجزات عظیم سے مضبوط اور پختہ فرمایا۔ نیز اپنے جامع اسوۂ حسنہ سے دین کے ان گوشوں کو جو خالی تھے پر کرکے دین کی ہر جہتی تکمیل فرمادی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کمل کردیا
اتممت علیکم نعمتی و رضیت	اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے
لکم الاسلام دینا۔	لئے دین اسلام پسند کیا۔

پس پہلی صورت میں ارباب دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم وجود پذیر نہیں ہوسکتی اور دوسری صورت میں نفس دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم کے نا ممکن تھی۔

حکمت تدریج اور نسخ شرائع

پھر جیسے طلوع آفتاب کے بعد اسے ایک جگہ ساکن نہیں رکھا گیا بلکہ متحرک بنایا گیا جو مشرق سے مغرب کی طرف چلتا رہتا ہے اور حرکت بھی مستقیم نہیں دوری رکھی گئی کہ ایک دائرہ پر گھومتا ہے اور ایک جگہ سے چلکر وہیں پھر آجاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔ پھر یہ حرکت بھی دفعی نہیں تدریجی رکھی گئی کہ چند منٹوں میں نہیں چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایکدم چھلانگ لگاکر مشرق سے خط استوار پر آجائے اور اس کے نکلتے ہی دن میں دھوپ کی وہی تیزی اور حدت و گرمی آجائے جو نصف النہار کے وقت ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ نصف النہار سے ایک ذقند بھرکر یکدم مغرب میں پہنچ جائے اور وہ نصف النہار کی روشنی و تیزی اکدم رفع ہوکر ٹھنڈک پیدا ہوجائے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ راتکے ٹھنڈے پائے

ہوئے اکدم طلوع کے وقت گرما جاتے اور استوار کے وقت کی انتہائی گرمی سہ
گھبائے ہوئے اچانک غروب سے بیکدم ٹھنڈ یا جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ان میں اس
دفعی اور اچانکی کی ٹھنڈک اور گرمی سے فساد مزاج پیدا ہو کر طرح طرح کی بیماریاں
لاحق ہو جاتیں اور اگر سرے سے آفتاب میں حرکت ہی نہ رکھی جاتی بلکہ وہ طلوع ہوکر
ایک نقطہ پر کھڑا رہا کرتا تو دنیا اس کی حدت و شدت سے تنگ آجاتی اس لئے
اسے متحرک بھی رکھا اور حرکت میں سرعت اور تیزی کے بجائے تدریج رکھی جسے
عروج و نزول اور قرب و بعد سے متفیہ فرما دیا تاکہ تدریج کے ساتھ کائنات ہر ہر
کیفیت کے اثرات سے آہستہ آہستہ متأثر اور مستفید ہو اور ہر اگلی حالت پچھلی حالت کو
بتدریج ختم کر کے اگلی کے لئے مزاجوں کو مستعد بناتی رہے۔ کیونکہ جب تک یہ پہلی
حالت ختم نہ ہو جو مزاجوں کی رعایت سے رکھی گئی تھی دوسری حالت کی استعداد نمایاں نہیں ہو سکتی

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے احوال میں بھی حق تعالیٰ نے ترقی رکھی ہے۔
جو ہمہ وقت حرکت میں ہے جس میں روحانی احوال کے عروج و نزول اور شدت و
خفت کی مختلف کیفیات نے ابھر ابھر کر روحانی مزاجوں پر اپنے اثرات ڈالے
اور مزاجوں کی ایک خاص انداز پر ترتیب دیا۔ ابتدار اسلام میں جو طلوع آفتاب
کے مشابہ زمانہ ہے آفتاب نبوت کی روشنی دھیمی اور ہلکی تھی جو طبیعتوں کے قریب
تھی کیونکہ زمانہ جاہلیت کی طبیعتیں ایکدم کمال دین کی خوگر نہیں ہو سکتی تھیں۔
نماز کی جو مکمل صورت آج ہے وہ ابتدار اسلام میں نہ تھی اس میں سلام و کلام سننا
سنانا ادھر اُدھر دیکھنا حرکت کر کے ادھر سے اُدھر ہو جانا سب جائز تھا کیونکہ
حدیث العہد اور نو مسلم لوگ اچانک اسلامی نماز کی ساری پابندیاں عائد ہو جانے

سے نماز ہی سے اکتا جاتے اور اسے برداشت نہ کرتے اس لئے جوں جوں طبیعتیں سہتی گئیں اسی طرح قیدیں عائد ہوتی گئیں۔ پہلے نقل و حرکت ممنوع ہوئی پھر ادھر اُدھر دیکھنے کی ممانعت ہوئی پھر سلام و کلام کی ممانعت آئی۔ اور حسب قول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ

فامونا بالسکوت ونھینا عن الکلام	پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور کلام کرنے سے روک دیا گیا۔

اگر ان ساری آزادیوں سے اکدم روک دیا جاتا تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے کہ سورج کی دفعی حرکت سے اکدم سردی سے گرمی میں پہونچا دیا جاتا سو اس سے اگر مادی مزاج فاسد ہوتا تھا تو اس سے روحانی مزاج فاسد ہو جاتا۔ پس رفتہ رفتہ ابتدائی احکام منسوخ ہوتے گئے اور جدید احکام آتے گئے۔ تاکہ طبائع اسے سہتی جائیں۔ اور روحانی مزاجوں میں بتدریج ترقی و سکون کی کیفیات پیدا ہوں یہی تدریجی نسخ احکام کی صورت کتوں کے ختم کرانے میں کی گئی۔ یہی تدریجی اور تنسیخی صورت شراب کے احکام میں رکھی گئی یہی تدریجی صورت صوم عاشورا اور ماہ رمضان کے روزوں کے لئے اختیار کی گئی۔ یہی تدریجی صورت وصیت و میراث کے احکام میں رکھی گئی یہی تدریجی صورت تشدد اور جہاد کے بارہ میں اختیار کی گئی غرض آفتاب نبوت کی شرعی نقل و حرکت سے بتدریج احکام آتے گئے اور تہذیب و ترتیب اختیار کر کے پچھلے احکام کو ہر باب میں ختم کرتے گئے۔ اس حکمت تربیت کے ماتحت کہیں شریعت تساہل سے تشدد کی طرف چلی ہے جیسے شراب بندی میں، اور کہیں تشدد سے تساہل کی طرف چلی ہے جیسے کتوں کے قتل کے بارہ میں مگر

تدریج اور تسہیل بہر دو صورت پیش نظر رکھی گئی ہے جو حکمت تربیت کی اساس و بنیاد ہے۔

پس آفتاب ہی کی تمثیل سے نسخ شرائع اور حکمت تربیت کا مشغلہ بھی آفتاب نبوت میں ثابت ہوا۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا۔ — ہم کسی آیت کا حکم جو منسوخ کر دیتے ہیں یا اس آیت کو فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں

عموم فیضان اور عمومیت بعثت پھر مادی آفتاب کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالئے کہ اس کا فیضان کسی فرد یا نوع یا جنس کی ساتھ خاص نہیں بلکہ اس آسمان کے نیچے کی کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی روشنی اور گرمی کے اثرات عام اور اس کی تنویر و تاثیر ہمہ گیر ہے وہ جس طرح امیروں کے محلات اور شاہی قلعوں پر روشنی اور گرمی ڈالتا ہے ایسے ہی غریبوں کی جھونپڑیوں اور فقیروں کی کٹیوں پر بھی ڈالتا ہے اور جس طرح انسانوں میں اس کی شعاعیں نفوذ کرتی ہیں جس سے بدن کی گہرائی تک متأثر ہوتی ہیں ایسے ہی حیوانات، نباتات اور جمادات بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتے۔ آفتاب چڑھنے پر شجر حجر کنکر پتھر لوہا لکڑی چمڑا اور کپڑا سب میں سوزش اور تپش کے آثار نمایاں ہونے ہیں۔ ندی نالوں اور تالابوں میں پانی تک اپنی خنکی کھو بیٹھتا ہے اور گرم ہو جاتا ہے۔ فضاء میں ہوا تک گرما جاتی ہے اور خود فضاء بھی گرم ہو جاتی ہے۔ غرض کوئی چیز بھی آفتاب کا اثر لئے بغیر نہیں رہتی۔ بلکہ ان سب کی زندگی ہی اس حرارت غریزی سے قائم ہے جو آفتاب انہیں بخشتا ہے۔

پھر آفتاب کی یہ فیض رسانی یکساں بھی ہے وہ ذرہ ذرہ پر چمکتا ہے اور سب کو

یکساں اپنی نورانیت اور حرارت کا فیض پہونچاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی کو نور کم بخشے اور کسی کو زیادہ کسی کو گرمی کم دے اور کسی کو بہت۔ گویا کسی کی نسبت وہ سخی ہو اور کسی کی نسبت بخیل نہیں اس کی وہ ایک ہی گرمی اور روشنی ہے جو سب پر یکساں پڑتی ہی لینے والے اگر اپنی صلاحیت و استعداد کے فرق سے لینے میں کمی زیادتی کریں یا آفتاب کے قرب و بعد کی وجہ سے کم زیادہ لیں تو یہ تفاوت خود ان کا ہے اس سے آفتاب کی عطاء وجود کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ سورج کا جو نور قبول کرے گا وہ کالا توا نہیں کر سکتا۔ لوہا پتھر دھوپ سے جتنا گرم ہوجاتا ہے لکڑی اور کپڑا اتنے نہیں ہوتے لیکن یہ سب ان کی قابلیتوں اور قبول کا فرق ہے آفتاب کی دین کا نہیں۔ غرض کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آفتاب کی روشنی اور گرمی کا فیض یکساں نہ پہونچ رہا ہو۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت اپنی علمی روشنی اور اخلاقی گرمی کائنات کے سارے نفوس کو یکسانی کے ساتھ پہنچا رہا ہے۔ امیر و غریب، قریب و بعید یگانہ و بیگانہ۔ ملکی اور غیر ملکی کالے اور گورے۔ آزاد اور غلام حتیٰ کہ مقر اور منکر سب ہی پر اس کے انوار یکساں پڑ رہے ہیں اور اس کا پیغام ساری دنیا کے لئے عام ہے اس نے جیسے غریبوں کو پکارا ویسے ہی سلاطین عالم کے نام بھی فرامین نبوت بھیجے وہ جیسے عوام اور سادہ لوحوں کے لئے راہنما ہے ویسے ہی خواص اور فلسفیوں کے لئے بھی راہبر ہے۔ اعلان کر دیا گیا کہ

بعثت الی الاسود والاحمر — میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں

عمومیت کے ساتھ پکارا گیا کہ

قل یا ایھا النّاس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعًا۔	آپ فرما دیجئے اے لوگو میں تم سب کا رسول ہو چکا۔

اور اقوام و انبیاء کی نسبت سے اس عمومیت کو اور زیادہ واضح الفاظ میں کھول دیا گیا کہ

کان النبی یبعث الی قومہ خاصّۃ وبعثت الی النّاس کافۃً۔	پہلے نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے رہے اور میں سارے انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں

جس سے عموم فیضان اور یکسانی ہدایت نمایاں ہے۔

ماننے والوں میں قبولیت کے مراتب لیکن ماننے والوں میں ہر ایک اس سے اپنی اپنی قابلیت و صلاحیت کی حد تک مستفید ہوا جس سے درجات و مراتب کا فرق پیدا ہوا اور اسی فرق کے سبب ماننے والوں میں کوئی صدیق و فاروق بنا اور کوئی نورہ ذوالنورین۔ کوئی اسد اللہ ہوا اور کوئی سیف اللہ۔ کوئی عیسٰی امت ہوا اور کوئی ابراہیمی نقش پر۔ کوئی محدّث ہوا۔ اور کوئی محدّث۔ کوئی حکیم بنا اور کوئی فقیہ۔ کوئی صالح بنا اور کوئی شہید۔ غرض اپنی اپنی صلاحیتوں کے فرق سے جسے جو بننا تھا وہ اسی روحانی سوزش و تپش اور نورانی آب و تاب سے بن گیا عطار نور و حرارت میں کوئی فرق نہ تھا۔

منکروں کے تاثرات پھر اس فیضان عام سے نہ صرف ماننے والے ہی اثر پذیر ہوئے بلکہ منکر اور کٹر سے کٹر معاند بھی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے آفتاب نبوت کے فیض سے محروم نہیں رہے۔ کسی قوم نے اس دین سے تمدن کا فائدہ اٹھایا اور کسی نے مذہب کی اصلاح و ترمیم کا۔ دنیا کی قوموں نے اپنے اپنے تمدنوں اور قومی و ملکی

دستوروں میں آفتاب نبوت کی شعاعوں سے ترمیمیں کیں تمدنی قوانین بدلے مذہبی عقیدوں میں فرق پیدا ہوا مشرک سے مشرک انسان بھی توحید کا نام لینے لگے۔ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا جو اندلس کی اسلامی تعلیمات کا اثر تھا ہندوؤں میں سکھ اور آریہ ورت پیدا ہوا جس نے توحید کا نام لینا شروع کیا۔ لوتھر نے اندلسی یونیورسٹیوں کی اسلامی تعلیم سے یورپ کے تمدن میں انقلاب برپا کیا منکر سے منکر قومیں بھی نبوت کی قوت قدسیہ کی قائل ہو گئیں۔ سیاسیوں نے اپنی سیاستوں کے دھارے بدلے۔ شاہیت سے عوامیت آئی شخصیت سے جمہوریت ہو گئی۔ تقرب خواص رابطۂ عوام کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ تشدد اور عدم تشدد کا فرق اور محل استعمال کھلا۔ تشدد کی جنگ کے ساتھ ذہنی اور عصبی جنگ کے نقشے بھی بنے مدنی زندگی کے ساتھ ملی زندگی بھی کم و بیش دنیا کا دستور بن کر رہی حکمرانی کا عنوان لیڈری کا چولہ پہن کر رہا۔ غرض تمدنی قومیں ہوں یا مذہبی قومیں سب کی سب آفتاب نبوت کی کرنوں اور شعاعوں سے درجہ بدرجہ متاثر ہو کر رہیں اور ان کے اندرون میں اس روحانی سورج کی تاثیر شعوری اور غیر شعوری طور پر گھس کر رہی۔ اگر یہ اقوام ان ہی اصولوں کو انقیاد و طاعت اور تسلیم و رضا کی ساتھ قبول کرتیں تو دنیا کی ساتھ آخرت بھی اس نور سے منور ہو جاتی جو اصل مقصود تھی لیکن ان کا یہ تاثر بلا مرضی مجبوری سے ہوا اور انھوں نے ہوا کا عام رُخ دیکھ کر ان تبدیلیوں کے سوا چارۂ کار نہ پایا تو انکی دنیا سطحی طور پر اس روشنی سے روشن اور اس گرمی سے گرم ہو گئی ہے۔ مگر آخرت کی تاریکی زائل نہ ہو سکی تاہم ماننے والوں کی طرح نہ ماننے والے بھی آفتاب نبوت کے فیضان سے بے تعلق اور بے اثر نہ رہ سکے جس کی تفصیلی مثالیں گزر چکی ہیں اور اس

طرح یہ فیض عام پورے عالم بشریت پر چھا گیا جیسے مادی سورج دنیا کے ہر ہر ذرہ پر چمک جاتا ہے۔

غیر ذی روح اشیاء پر آفتاب نبوت کا اثر پھر یہ فیضان عام نہ صرف عالم بشریت ہی تک محدود رہا بلکہ جمادات نباتات اور حیوان و جنات تک بھی اس صدائے عام کے اثرات پہنچے۔ جیسے مادی آفتاب کی روشنی اور گرمی کا اثر ان تک پہنچتا ہے۔ کنکریاں دست مبارک میں آئیں تو تسبیح پڑھنے لگیں، کھجور کے سوکھے تنے کو کچھ دن آفتاب نبوت کی صحبت و معیت کی گرمی ملی تو وہ عشق نبوی سے اتنا گرمایا کہ عارفین کاملین کی طرح فراق نبوی میں گریہ و بکا کرنے لگا۔ حدیبیہ میں کیکر کے درخت سے آفتاب نبوت کا بدن مبارک قریب ہو گیا تو وہ شجرۃ الرضوان بن گیا جس کو رب العالمین نے اپنے کلام مبارک میں سراہا۔ شجر و حجر میں سلام کرنے اور نبوت کی شہادتیں دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جانور اپنی اپنی فریادیں لانے لگے اور پیغمبر کے حق فیصلہ سے مطمئن ہو ہو کر جانے لگے۔ اونٹوں نے آ کر قدم مبارک پر سر رکھا رو رو کر اپنے مالک کے ظلم و ستم کی فریاد کی اور مراد پا گئے۔ بھیڑیوں نے صداقت نبوی کی شہادتیں دینی شروع کر دیں۔ قربانی کے لئے جانور خود اپنے کو پیش کرنے لگے جبکہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ کی قربانی فرمائی تو ذبح ہونے کے لئے ہر ایک خود آگے بڑھتا اور گردن جھکا کر دست مبارک سے ذبح ہونے کیلئے پیشقدمی کر رہا تھا

ع سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

چلتا پانی تسبیح الٰہی کرنے لگا۔ سفید کپڑا تسبیح خداوندی میں لگ گیا ہری ٹہنیاں تسبیح میں مصروف ہوئیں، چرند پرند اپنی اپنی زبان میں تسبیح پڑھنے لگے۔ جنات کے وفود

مواعظ نبوی کی فرمائش لیکر آنے لگے اور متأثر ہو کر اسلام کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بادلوں پر نگاہ پاک پڑی تو وہ سایہ گستری کی خدمات انجام دینے لگے اور سر مبارک کیلئے دھوپ میں چھتری بن گئے۔

مکان اور فضا میں آفتاب نبوت کے آثار پھر نہ صرف اس جہان کے اعیان واشخاص یعنی جماد و نبات اور جن و حیوان ہی اس آفتاب روحانی سے روشن ہوئے بلکہ وہ مکان اور خلاء بھی جس میں گھر اور گھروں والے جاگزیں ہیں۔ آفتاب نبوت سے گرمائے بغیر نہ رہے جن کے یہ اشخاص مکین اور باشندے ہیں پس جیسے مادی آفتاب سے فضا روشن اور گرم ہوتی تھی ایسے ہی روحانی آفتاب سے بھی وہ معنوی روشنی اور گرمی حاصل کر رہی ہے جو عبادت الٰہی کی روشنی ہے۔ اولاً اس وجہ سے کہ جو بھی طاعت و عبادت کوئی ذی روح یا غیر ذی روح انجام دے گا۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی جگہ اور مکان ہی میں واقع ہو گی۔ لامکان میں نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں مکان ظرف عبادت اور وسیلۂ طاعت بن جائے گا۔ اور سب جانتے ہیں کہ وسیلہ مقصود کے حکم میں ہوتا ہے اس لئے اگر عبادت مقدس فعل ہے اور ضرور ہے تو اس کے ظرف کا مقدس ہونا بھی ضروری ہے جیسے عطر اگر خوشبودار ہے اور بلاشبہ ہے تو اس کے شیشے اور کنستر کا خوشبودار ہو جانا بھی قدرتی ہے۔ اس دلیل سے مکان عبادت کا مقدس ہو جانا واضح ہو گیا۔ چنانچہ اس اصول پر شریعت نے مساجد کو خیر البقاع (ساری جگہوں میں پاکیزہ ترین جگہ) فرمایا کہ وہ پاکیزہ ترین عمل یعنی عبادت کی جگہ ہے اور بازار کو شر البقاع (ساری جگہوں میں بدترین جگہ) کہا کہ وہ عموماً دنگہ فساد اور جھگڑوں جیسے ناپاک عمل کی جگہ ہے جس سے مکان کے خیر و شر ہونے کا معیار واضح ہو گیا

کہ وہ عبادت ہے اور عبادت بلاشبہ آفتاب نبوت کا اثر ہے۔ جس جس موضع میں عبادت اور اطاعت خداوندی ادا کی جائے گی۔ بلاشبہ اس موضع اور مکان کو بھی آفتاب نبوت سے متاثر کہا جائیگا۔ اس لئے واضح ہو گیا کہ مکین ہی نہیں خود مکان بھی آفتاب نبوت کی روشنی اور گرمی سے اثر پذیر ہے۔

پھر یہ مکان نہ صرف واسطۂ عبادت ہونے ہی کی وجہ سے مقدس بن گیا ہے بلکہ براہ راست خود بھی عبادت گذار اور بلاواسطہ آفتاب نبوت سے یہ معنوی روشنی اور گرمی لے رہا ہے۔ چنانچہ جس راستہ سے حضور گذر گئے وہی مقدس بن گیا۔ جائے ولادت مقدس، جائے وفات مقدس۔ جائے دفن مقدس اور زیارت گاہ خلائق۔

بمقامیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

زمین کے گڈھوں اور قبروں تک سے قرآن خوانی کی آوازیں آنے لگیں زمین کے جس خطہ کو کسی غلام نبوی سے بھی نسبت ہو گئی وہ بھی مقدس بن گیا۔ زمین کے جس حصہ پر کسی بھی عبد صالح نے عبادت کا وظیفہ ادا کر لیا تو وہ خطہ سرکاری گواہ بن گیا اور قیامت کے دن اپنے عابد کے بارہ میں اس کی گواہی معتبر اور مقبول ہو گی گویا عدالت و پارسائی جو گواہوں کے مخصوص اوصاف ہیں اس خطہ کے نصیب میں آ گئے جو اس کے مقدس ہو جانے کی واضح دلیل ہے۔ جس بیت کو صاحب نبوت سے دور کی بھی نسبت ہو گئی وہی بیوت اللہ (اللہ کے گھروں) میں شمار ہونے لگا۔ عالم کی ساری مسجدیں ساری خانقاہیں، سارے مدارس سارے وہ ادارے جنمیں خدائی احکام کی تنفیذ و اجراء عمل میں آئے ساری مجالس وعظ و تذکیر سارے مقامات مذاکرۂ علم و عمل

ساری مقدس پہاڑیاں اور وادیاں جو کسی نہ کسی صاحب الہام صاحب وحی کی طرف منسوب ہوں (درحالیکہ ہر صاحب وحی والہام اور ہر صاحب کشف و منام خواہ وہ اگلوں میں ہو یا پچھلوں میں بالآخر خاتم النبیین کی طرف منسوب اور خاتم ہی کے فیض سے مستفیض ہے) ان نسبتوں کے سبب مقدس اور عبادت گذار شمار ہوں گے کہ انہیں کسی نہ کسی واسطہ سے آفتاب نبوت سے نسبت حاصل ہو گئی۔ حرم کعبہ۔ حرم مکہ حرم مقدس۔ حرم مدینہ۔ مسجد حرام۔ مسجد اقصیٰ۔ مسجد نبوی۔ مسجد قبا۔ مسجد خیف۔ مسجد نمرہ وغیرہ وغیرہ۔ پھر قبر مبارک میں وہ بقعہ جس میں جسم مبارک محفوظ ہے، وہ عرش سے بھی افضل ہے کہ اس سے جسم لطیف لگا ہوا ہے۔ پھر پہاڑوں کے سلسلہ میں جبل طور جبل نور۔ جبل حرا۔ جبل ثور۔ جبل احد۔ وادی سینا۔ وادی آدم۔ دریاؤں میں سیحون و جیحون اور نیل و فرات وغیرہا۔ کنوؤں میں بیر زمزم اور مدینہ کے مشہور سات کنوئیں بیر اریس، بیر خاتم۔ بیر بضاعہ وغیرہا اور تمام وہ مبارک خطے جن میں ان مقدسین کی کوئی نسبت لگی ہوئی ہے یا وہ ان کے نام لگے ہوئے ہیں پھر تمام وہ مشاہد و آثار اور عالم کے تمام مقامات مقدسہ اسی لئے مقدس ہوئے کہ انہیں آفتاب نبوت سے کوئی نسبت و مناسبت حاصل ہے۔ پس کوئی مقام تو وہ ہے جسے شریعت نے نام لیکر صاحب نسبت کہا اور اس کا بالفعل مقدس ہونا خود متعین کیا جیسے مقامات مذکورہ اور بعض وہ ہیں جنہیں نیک انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر ظرف عبادت قرار دیا یعنی جو انسان جہاں بھی عبادت کرلے وہ جگہ مقدس اور اس کے حق میں گواہ بن جائے گی۔ اور چونکہ یہ صلاحیت ہر خطہ میں ہر وقت ہے اس لئے گویا سارے جہان کے تمام خطوں کو بالقوۃ مقدس فرما دیا۔

اس حقیقت کو حدیث ذیل میں ارشاد فرمایا گیا کہ

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَھُوْرًا۔ — میرے لئے ساری زمین جائے عبادت اور ذریعۂ پاکی بنا دی گئی ہے۔

اس صورت میں زمین کا کونسا خطہ باقی رہ جاتا ہے جو بالفعل یا بالقوہ بالخصوص یا بالعموم آفتاب نبوت کی روشنی اور گرمی سے بے تعلق کہا جائے حاصل یہ کہ جہاں بھی آفتاب نبوت کی کوئی شعاع اور کرن پہنچ گئی وہی خطہ روشن اور گرم ہوگیا۔ بالواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی اور ظاہر ہے کہ مکان عالم کی ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے کوئی بھی مکانی شے اس کے گھیرے سے باہر نکلی ہوئی نہیں اور جب وہ خود ہی کل کا کل آفتاب نبوت سے مستفید ہے تو اس کے احاطہ کی کوئی شئے باقی رہ جاتی ہے جو اس کے نورانی اثرات سے الگ یا بے تعلق رہ جائے؟ اس سے واضح ہوگیا کہ جس طرح مادی سورج کا حسی فیضان دنیا کے ہر ہر خطہ میں پہونچا ہوا ہے کہ مکان اور مکین کا کوئی فرد اس سے محروم نہیں اسی طرح اس روحانی سورج کا معنوی فیضان بھی ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے جس سے فضا رو مکان اور ان کے مکینوں کا کوئی فرد بچا ہوا نہیں ہے۔ البتہ بعض کو آفتاب نبوت نے خود اپنے انتخاب سے نام لیکر بالفعل نورانی کہا ہے اور بعض کو مطیع انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر بالقوہ نورانی تبلا دیا ہے۔

آفتاب نبوت کے اثرات زمانہ پر پھر جس طرح مادی سورج کا فیضان مکان اور مکانی اشیا تک محدود نہیں بلکہ اس کی روشنی اور گرمی زمانہ کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت کی فیض رسانی بھی مکان اور مکانیات سے گذر کر زمانہ اور زمانی اشیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ جس دن پر نگاہ پڑ گئی وہی دن مقدس ہوگیا جیسے

رات پر نگاہ جا پڑی وہی رات پاکیزہ ہوگئی وہ ساعتیں وہ مہینے وہ سال وہ حصہ
زمانہ جو آفتاب نبوت کی کسی نسبت کے نیچے آگیا وہی مقدس مقبول اور مبارک
بنگیا اور اسی طرح جو اشیار زمانہ کے گھیرے میں آگئیں وہ بھی مبارک ہوگئیں جس کی
صورت یہ ہے کہ جس طرح کائنات کے ذرہ ذرہ کو مکان نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے اور
کوئی جسمانی چیز ایسی نہیں جو مکان اور جگہ سے مستغنی ہو بقول فلاسفہ کلُ جسمٍ
فلہٗ حَیِّزٌ طبیعیٌ (ہر جسم کے لئے طبعی طور پر کوئی نہ کوئی جائے قرار اور مکانی ظرف ضروری
ہے) اسی طرح عالم کی کوئی شئے زمانہ کے احاطہ سے بھی باہر نہیں ہوسکتی یعنی زمانہ بھی
مکان کی طرح کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ بلکہ زمانہ کا احاطہ مکان کے احاطہ سے
بھی بڑھا ہوا ہے کیونکہ مکان تو صرف موجودات کو (جو پیدا ہوچکی ہیں) اپنے احاطہ
میں لئے ہوئے ہے۔ غیر موجود اشیا یعنی معدومات سے مکان کا کوئی تعلق نہیں اور
نہیں کہا جا سکتا کہ جو چیزیں ابھی پیدا نہیں ہوئیں وہ فلاں مکان میں بند ہیں لیکن
زمانہ موجودات کے ساتھ ان معدومات کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے جو ابھی
تک پیدا نہیں ہوئیں کیونکہ زمانہ فقط حال ہی کو نہیں کہتے جس میں موجود اشیاء
سمائی ہوئی ہیں بلکہ ماضی کو بھی کہتے ہیں جس میں گذری ہوئی اشیا بھری ہوئی
ہیں ہر مرنے والی شے کو کہتے ہیں کہ وہ ماضی ہوگئی یعنی زمانۂ ماضی میں چلی گئی۔ پھر زمانہ
ہی کا حصہ مستقبل بھی ہے یعنی آئندہ زمانہ جس میں وہ چیزیں سمائی ہوئی ہیں جو ابھی تک
پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ پس ماضی کے احاطہ میں پیدا ہو کر گذر جانے والی اشیا گھری
ہوئی ہیں اور مستقبل کے احاطہ میں ناپیدا شدہ اشیا گھری ہوئی ہیں اور حال کے
احاطہ میں صرف وہ اشیا گھری ہوئی ہیں جو پیدا ہو کر موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ

حال میں گھری ہوئی موجودات سے گذری ہوئی ماضی کی اشیاء اور آنے والی مستقبل
کی اشیاء کہیں زائد ہیں اس لئے زمانہ حال کی گرفت بہ نسبت ماضی و مستقبل کے بہت
کم ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ مکان کے احاطہ میں صرف وہی اشیاء آئی ہوئی ہیں جو حال
کی گرفت میں ہیں۔ ماضی و مستقبل کی اشیاء سے مکان کا کوئی تعلق نہیں اس لئے واضح ہو گیا
کہ مکان کا احاطہ زمان کے احاطہ سے بہت چھوٹا اور مختصر ہے اور اس کے احاطہ میں
بہ نسبت زمانہ کے احاطہ کے بہت کم چیزیں آئی ہوئی ہیں جو مکان اور زمان کے
احاطوں میں فرق کی کھلی دلیل ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ کائنات کی وہ اشیاء جو مکان کی گرفت میں آئی ہوئی ہیں
خود تو رات دن متحرک ہیں مگر مکان ساکن ہے اور ان اشیاء کو گھیرے ہوئے اپنے مقام
پر ساکن اور غیر متحرک ٹھہرا ہوا ہے لیکن زمانہ ان اشیاء کو گھیرے ہوئے خود حرکت میں
ہے اور زمانی اشیاء ساکن ہیں۔ کوئی شئے خود حرکت کر کے ایک زمانہ سے دوسرے
زمانہ میں نہیں جاتی بلکہ زمانہ خود ان پر سے گذرتا اور آتا جاتا رہتا ہے۔ ماضی گذر رہی
اور پیچھے کو جا رہی ہے گویا بعید ہو رہی ہے مستقبل آرہا ہے اور اشیاء سے قریب
ہوتا جا رہا ہے اور حال ان دونوں حالوں کے درمیان ایک موہوم سا نقطہ ہے
جو دونوں طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے زمانہ کو اشیاء سے
قریب آتا ہوا اور بعید ہوتا ہوا کہکر زمانہ کو گویا متحرک کہا ہے اور اشیاء کو ساکن
فرمایا۔ اقترب للناس حسابهم وهم في غفلة معرضون۔ لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا مگر یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ قیامت قریب آگئی اور قمر شق ہوگیا۔

اور زمین کو فراش فرمایا۔ والارض فراشا جو اس کے ساکن ہونے کی علامت ہے کیونکہ فراش حرکت نہیں کرتا۔ صاحب فراش اس پر حرکت کرتا ہے۔ بہر حال کائنات کا ذرہ ذرہ زمان و مکان کی گرفت میں ہے مگر مکان ساکن ہے اور مکانی اشیاء متحرک ہیں اور زمانہ خود متحرک ہے۔ اور زمانی اشیاء ساکن ہیں۔ مگر اس فرق کے باوجود کہ زمانہ کا احاطہ مکان سے وسیع تر اور متحرک تر ہے دونوں کا یہ قدر مشترک اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مکان و زمان کائنات کے ذرہ ذرہ کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں اب غور اس پر کیجئے کہ یہ زمان اور مکان باوجود اپنی بے انتہا احاطی وسعتوں کے دونوں کے دونوں مل کر خود آفتاب کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں چنانچہ جیسے مکان اور مکانی اشیاء آفتاب سے منور اور گرم ہوتی ہیں ایسے ہی زمانہ اور زمانی اشیاء بھی آفتاب سے گرم اور منور ہیں۔

زمانہ کا وجود آفتاب سے ہے بلکہ زمانہ مکان کی نسبت زیادہ سے زیادہ آفتاب کی گرفت میں ہے۔ کیونکہ مکان صرف آفتاب سے متأثر ہے آفتاب کا بنایا ہوا نہیں ہے لیکن زمانہ کا تو وجود ہی آفتاب سے ہے۔ کیونکہ زمانہ نام ہی آفتاب کی گردش کا ہے۔ وہ طلوع غروب نہ کرے تو رات دن بھی نہ بنیں اور رات دن نہ ہوں تو وقت اور زمانہ نہ ہو۔ اس لئے زمانہ گویا آفتاب کی اولاد اور اس سے پیدا شدہ ہو تو نکلا تو زمانہ کا مکان کی بہ نسبت آفتاب سے زیادہ متأثر ہونا قدرتی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات اور دن گرم بھی ہوتے ہیں اور منور بھی، دن کا گرم اور روشن ہونا تو سب محسوس کرتے ہیں لیکن رات کا موسم گرما میں گرم ہونا آخر آفتاب کے سوا

کیس کا اثر ہے اور پھر ستاروں کی روشنی سے کسی حد تک منور ہونا گو بظاہر ستاروں کا اثر ہے لیکن خود ستاروں کی روشنی درحقیقت آفتاب کی روشنی ہے. فلاسفوں کے دعووں کے مطابق چاند ستارے بعض شفاف قسم کے اجسام ہیں جنہیں خود روشنی نہیں ان میں یہ چمک دمک آفتاب کے تقابل سے آتی ہے، اس لئے رات کا ستاروں سے منور ہونا بالواسطہ سورج ہی سے منور ہونا ہے. پس دن بھی اور رات بھی سورج سے گرمی اور روشنی دونوں چیزیں لے رہے ہیں. اس لئے زمانہ بھی آفتاب کے فیض سے محروم نہیں کہ آفتاب ہی سے بنتا بھی ہے اور اسی سے آثار بھی لیتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت بھی اپنا زمانہ خود بناتا ہے. وہاں مادی سورج کی حسی گردش سے حسی رات اور دن بنتے تھے کہ سورج نکل آیا تو دن ہو گیا سورج چھپ گیا تو رات ہو گئی. اس لئے سورج کی جھلکیاں رات اور دن کی تباقی رہتی ہیں. یہاں روحانی سورج کی شرعی نقل و حرکت سے شرعی رات اور دن بنتے ہیں جب یہ روحانی سورج طلوع کرتا ہے تو شرعی دن ہو جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور دونوں میں ہزاروں مصالح مخفی ہیں۔ دن سورج کی افادہ کا وقت ہے۔ اور رات خود اس کے استفادہ کا۔ جیسے مادی سورج رات میں نگاہوں سے اوجھل ہو کر بنصّ حدیث عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے اور طلوع کی اجازت چاہتا ہے. گویا سجدۂ نیاز سے نیا نور اور نور کی نئی زندگی لے کر آنیوالے دن کو نور بخشنے کی تیاری کرتا ہے اور افادی شان سے طلوع کرتا ہے. اسی طرح آفتاب نبوت راتوں میں عام نگاہوں سے اوجھل ہو کر قیام لیل اور سجدہ ہائے عبودیت

کے لئے عرش تک پہنچتا ہے اور آیندہ کے افادات کے لئے نئی روحانی قوتیں لیکر پھر دن میں طلوع کرتا ہے تاکہ خلق اللہ کی رہنمائی فرمائے۔ فرق اتنا ہے کہ مادی سورج غروب ہو کر زمین کے نیچے جاتا ہے اور عرش کے نچلے حصہ کے سامنے ہو کر بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتا ہے لیکن روحانی سورج غروب ہو کر زمین سے بالاتر بلکہ آسمانوں سے بھی گذر کر حتی کہ عرش کے بالائی حصہ تک پہنچکر رب العرش العظیم کو سجدہ کرتا ہے اور وہاں سے نئی سے نئی روحانی زندگی لیکر پھر عالم کی طرف لوٹتا ہے تو دن ہو جاتا ہے اور ان قوتوں سے افادہ کا وقت آجاتا ہے۔ گویا دن اس کی اجتماعی اور جلوۃ کی زندگی کا ظہور ہے اور رات اس کی دل جمعی اور انفرادی یا خلوۃ کی زندگی کا ظہور ہے۔ بہرحال جیسے طلوع و غروب سے مادی سورج دن اور رات بناتا ہے ایسے ہی روحانی طلوع و غروب سے روحانی سورج شرعی دن اور رات بناتا ہے اور اس طرح روحانی آفتاب کا بنایا ہوا زمانہ بھی مادی آفتاب کے بنائے ہوئے زمانہ کے دوش بدوش قائم ہے۔

آفتاب نبوت کے ایام اب اگر آپ مادی سورج کے بنائے ہوئے زمانہ پر غور کریں تو نظر آئیگا کہ وہ کل زمانہ جو سورج سے بنتا ہے حقیقتاً صرف سات دن اور سات راتیں ہیں۔ اس لئے پوری دنیا کی کل عمر سات دن سات رات یعنی ایک ہفتہ سے زائد نہیں البتہ یہ ہفتہ چونکہ لوٹ لوٹ کر بار بار آتا رہتا ہے تو اس کی تکرار کی حد تک دنیا اور دنیا کی قوموں اور دنیا کے بڑے بڑے حوادث کی عمریں دراز ہو جاتی ہیں اور ہزاروں برس کی کہلائی جاتی ہیں مگر ان لمبی سے لمبی عمروں کا حاصل ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔

سات دن کا ہفتہ یوم السبت (شنبہ) سے شروع ہو کر یوم الجمعہ پر ختم ہو جاتا ہے اور یہی ہفتہ پوری دنیا کی اصل عمر ہے گو مکرر ہوتا رہے۔ اگر دنیا کی عمر یہ ہفتہ رکھنا منظور نہ ہوتی یا بالفاظ دیگر ہفتہ بھر سے زائد عمر ہوتی سورج کو گردش دینے کے بجائے ایک سمت سے سیدھا چلا کر ہمیشہ آگے ہی کی طرف خط مستقیم پر دوڑاتے رہتے وہ کبھی غروب نہ ہوتا اور مشرق و مغرب میں بار بار گھوم کر ایک ہی دائرہ میں چکر نہ کھاتا رہتا مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں صرف ایک دن بنتا جو ہزاروں سال کی برابر ہوتا اور اس میں رات کا واسطہ بیچ میں نہ آتا۔ مگر اس صورت میں وہ تمام تغیرات و حوادث اور ان کی بے انتہا مصالح جو رات کے بعد اور دن کے بعد رات کے ادل بدل میں پنہاں ہیں فوت ہو جاتیں۔ زمانوں کی کوئی حد بندی نہ ہوتی کوئی مدت معین نہ ہو سکتی کوئی حساب نہ بن سکتا، نہ مہینے بنتے نہ سال، نہ سنہ پیدا ہوتے نہ تاریخ اور اس طرح دنیا کی تاریخ ہی نہ بن سکتی جس سے عبرتوں اور مصلحتوں کے سارے کارخانے درہم برہم ہو جاتے اس لئے سورج کی چال میں بجائے مستقیم حرکت کے دورانی حرکت اور گردش رکھی گئی جس سے طلوع و غروب پیدا ہوا اس سے رات اور دن بنے تاکہ وہی رات اور دن لوٹ لوٹ کر زمانہ کی مقداریں بناتے رہیں اور ان تمام مصالح کائنات کا وجود ہوتا ہے جو اس لیل و نہار کے انقلاب سے وابستہ ہیں۔ نیز طبائع میں اس لیل و نہار کی تجدید سے تجدّد پیدا ہوتا رہے۔ تاکہ طبیعتیں روزانہ تازہ بتازہ اور نو بہ نو ہو کر سعی و عمل کے میدانوں میں دوڑتی رہیں اور عالم کے مصالح نمایاں ہوتے رہیں گو اس طریق سے عالم کی عمر کل ایک دن نکلتی ہے جو لوٹ لوٹ کر بار بار آ سکتا ہے اور عالم کی عمر دراز

ہوسکتی ہے لیکن اس صورت میں حساب قائم کرنے اور حوادث کی عمریں متعین کرنے میں دشواریاں لاحق ہو جاتیں گویا سارے انسان ایک ہی دن کی پیدائش ہوتے ایک ہی دن موت کا ہوتا ایک ہی دن شادی بیاہ کا ہوتا ایک ہی دن عمر کے ہر حادثہ کا، تو امور زندگی میں تمیز کرنا ہی دشوار ہو جاتا اس لئے دن اور رات کی ساتگردشیں رکھ کر عالم کی عمر ایک ہفتہ کردی گئی اور سات ناموں کے سات دن رکھدیئے گئے اور انکے تکرار سے مہینے متعین کئے گئے وہ بارہ رکھدیئے گئے تاکہ مہینوں کے ساتھ دنوں کا اور دنوں کے ساتھ ساعتوں اور گھنٹوں کا تعین بآسانی ممکن ہو جائے

شاید اسی لئے قرآن حکیم نے دنیا کی تخلیق اور پیدائش کے سلسلہ میں ایک دن کے بجائے سات دن کا ذکر کیا ہے چھ کا صراحۃً اور ایک کا اشارۃً۔ فرمایا۔

ان ربکم اللہ الذی خلق السموٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوٰی علے العرش۔	بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر عرش پر متمکن ہو گیا۔

اس آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ چھ دن کائنات کی تخلیق کے ہیں اور ایک دن استوار علی العرش کا جسے یوم الفراغ کہنا چاہئے۔ اور وہ ان چھ کے علاوہ ہی ہوسکتا ہے اور بعد ہی کا ہوسکتا ہے کیونکہ تخلیق عالم کے چھ دن ناقص اور ناتمام تو مراد ہو ہی نہیں سکتے کہ ستۃ ایام کا لفظ مطلق رکھا گیا ہے اور مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوتا ہے اس لئے یہ چھ دن بلاشبہ کامل دن مراد ہوئے اور چھ دن کی تکمیل کے بعد جو وقت آئیگا اسے ہی ساتواں دن کہا جاویگا۔ اور وہی استوار کا دن ہے اس لئے اس آیت سے دنیا کی تخلیق کے سلسلہ میں مجموعۂ عمل و فراغ کے دن سات ہی نکلتے ہیں

چھ صراحتاً اور ایک کنایۃً اور یہ ایک دن یقیناً چھ کی تکمیل کے بعد ہی کا دن ہو سکتا ہے جیسا کہ لفظ ثم اس چھ کی بعدیت کی واضح دلیل ہے. تو تخلیق عالم اور اس سے فراغت کی مجموعی مدت نص قرآنی کی روشنی میں وہی ایک ہفتہ ہو گیا. نیز احادیث میں جبکہ مخلوقات دنوں پر تقسیم کی گئی ہیں اور ان کی تخلیق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوئی تو چھ دن تو اس روایت سے ثابت ہوئے اور ایک دن یوم السبت کا ذکر صراحۃً دوسری حدیث میں آچکا ہے جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔ اس لئے زمانہ کے سات ایام جس طرح آیت سے نکلے گو عدداً ہی سہی اسماءً سہی ایسے ہی احادیث سے بھی نکلے مگر تفصیلاً اور اسماً

ہفتۂ دنیا پر اقوام عالم کا اجماع | پھر یہ ہفتۂ دنیا کی مدت جیسے قرآنی صراحت دلالت اور حدیث سے ثابت ہوتی ہے ایسے ہی اجماع اقوام سے بھی ثابت شدہ ہے جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اتفاق ہے. یہود کے یہاں یوم السبت (شنبہ کا دن) واجب التعظیم اور یوم عید ہے. وہ کہتے ہیں کہ یہ یوم الراحۃ ہے جس میں حق تعالےٰ نے تخلیق عالم سے فراغت پا کر راحت پائی یعنی اتوار کے دن سے شروع ہو کر جمعہ کے دن تخلیق عالم پوری ہوئی تو شنبہ کا دن یوم الراحت ہوا اور کسی مہم کام سے فارغ ہو کر جب راحت کی ساعتیں آتی ہیں تو وہ قدرتاً خوشی کی گھڑیاں ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ دن خوشی کا بھی ہونا چاہئے اور عید و تہوار کا بھی جس سے ہفتہ کا ثبوت بنص حدیث یہود کے یہاں نکلا. نصاریٰ نے یوم الاحد (اتوار) کو واجب التکریم دن کہا اور عید مقرر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس دن عالم کی تخلیق کا آغاز ہوا اور جن ساعتوں میں کسی امر مہم کا افتتاح کیا جاتا ہے تو وہ وقت خوشی کا ہوتا ہے، چنانچہ امور مہمہ کے افتتاح کے وقت

جلسے کرتے ہیں، کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں تو تعمیر کے اس افتتاح پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کسی تعمیر کے مکمل ہونے پر جب اس کے استعمال کا آغاز کرتے ہیں تو عادۃً اس میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس لئے جبکہ اتوار کا دن عالم کی تخلیق کے افتتاح کا دن تھا تو وہی دن یوم عید ہونا چاہئے۔ اس سے نصاریٰ کے یہاں بھی سات دن کا ثبوت ملا۔

مسلمانوں نے کہا کہ جمعہ کے دن تخلیق کائنات کی تکمیل ہوئی اور پورا عالم مکمل بنکر تیار ہوگیا۔ اور جن ساعتوں میں کوئی مہم حد کمال کو پہنچتی ہے تو وہ وقت بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں کے لئے انتہائی خوشی کا ہوتا ہے اس لئے جمعہ اس قابل ہے کہ اسے خوشی اور عید کا دن قرار دیا جائے اس سے بھی وہی سات دن ثابت ہوئے۔ رہا یہ کہ اس ہفتہ میں ایک دن ہر قوم کے یہاں خوشی اور عبادت کا دن ہے تو اس میں کسی قوم کا انتخاب کردہ دن خوشی کے لئے موزوں اور عبادت کے لئے مناسب ہے۔ سو غور کیا جائے تو شے بناکر فراغت و راحت کی ساعتوں کا پالینا شے کی تکمیل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا خود اپنی راحت و فراغت کی گھڑی سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی راحت پر خوش ہولینا شئے کی تکمیل کی خوشی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک مستقل خوشی ہے جو نفس شئے کے آغاز و انجام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس لئے یہود کی خوشی درحقیقت تخلیق عالم کی تکمیل پر نہ ہوئی بلکہ اسے منا کر فارغ ہوجانے پر ہوئی جو بنانے والے کی راحت کی خوشی ہے۔ اس لئے شئے پر خوشی کے دو ہی درجے نکلتے ہیں یا اس کا افتتاح یا اس کا اختتام یعنی یوم آغاز یا یوم تکمیل اس لئے نصاریٰ اور مسلمین کی خوشی درحقیقت عالم کی خلقت پر ہوئی نہ کہ اس سے فراغت پر کہ وہ تخلیق

سے زائد ایک شئے ہے۔ اس لئے اگر یہ خوشی عالم کی خلقت سے متعلق ہو اور بلاشبہ
اس سے ہے تو معقول خوشی درحقیقت نصاریٰ و مسلمین ہی کی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن
پھر ان دونوں خوشیوں میں اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی خوشی فطرۃ سے زیادہ قریب
اور زیادہ مطابق ہے کیونکہ کسی شے کے آغاز پر خوشی ضرور ہوتی ہے مگر اس وقت
خود شئے کا وجود نہیں ہوتا یا کامل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ خوشی اگر ہوتی ہے تو شے کے
ارادہ پر ہوتی ہے نہ کہ خود شئے پر کہ وہ ابھی ہے ہی نہیں۔ ہاں شئی پر خوشی وہی ہوگی
جو شئے کے موجود ہو جانے پر ہوگی۔ اور شئے کا موجود کہلانا اس کی تکمیل پر ممکن ہے
نہ کہ قبل از تکمیل۔ اس لئے مکمل خوشی اور اقرب الی الفطرۃ خوشی مسلمانوں کی خوشی
ثابت ہوتی ہے جنھوں نے اس دن کو عید منایا جو تخلیق عالم کی تکمیل کا دن ہے یعنی
یوم جمعہ، یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یوم جمعہ کو عید منانا اور خوشی کے ساتھ یوم عبادت
ٹھیرانا منشاء خداوندی بھی تھا کیونکہ حدیث صریح میں فرمایا گیا ہے کہ یوم جمعہ کے
بارہ میں یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا منجانب اللہ امتحان لیا گیا کہ ہر ایک قوم ہفتہ
میں ایک دن یوم عبادت مقرر کرے جو اس کی روحانی خوشی کا دن ہو۔ یہود نے یوم
السبت (شنبہ) مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم الراحت ہے۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (یکشنبہ)
مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم الافتتاح ہے اور مسلمانوں نے یوم جمعہ مقرر کیا اور کہا کہ وہ
یوم التکمیل ہے اور تکمیل ہی پر خوشی منائی جاتی ہے جبکہ وہ اپنے منافع دکھلانے
کے قابل ہو جائے۔ اسی لئے شریعت اسلام میں عید الفطر کو خوشی کا دن رکھا گیا کہ
روزوں کی تکمیل کی حد آخر ہے۔ عید الاضحیٰ خوشی کا دن رکھا گیا کہ مناسک حج کی تکمیل کی حد
آخر ہے ٹھیک اسی طرح یوم جمعہ کو یوم عید رکھا گیا کہ تخلیق عالم کی تکمیل کی حد آخر کا دن تھا

اس سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا جمعہ کو بوجہ یوم تکمیل ہونے کے عید منانا مذاق شریعت کے مطابق تھا۔ چنانچہ اسے فوراً ہی شریعت نے قبول کر لیا اور شریعت بنا دیا بہرحال جہاں اس سے ہر قوم میں ایک ایک دن یوم عید ثابت ہوا وہیں ان کے یہاں ایام کی تعداد کا سات دن ہونا بھی ثابت ہوا اور واضح ہو گیا کہ زمانہ کی اصل مدت فی الحقیقت سات ہی دن ہے جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اجماع ہے۔

پھر یہ ساتواں دن یعنی یوم استوار یا یوم الفراغ بھی عالم ہی سے متعلق ہے کیونکہ استوار علی العرش تدبیر و تصرف کے لئے تھا جس سے عالم کی بقاء ہے اس لئے چھ دن اگر عالم کے حدوث کی تکمیل کے لئے تھے تو ساتواں دن عالم کی بقاء کی تدابیر کے لئے تھا اس لئے یہ ساتواں دن بھی عالم کی تخلیق ہی سے متعلق تھا نہ کہ یوم الراحۃ تھا جیسا کہ یہود کہتے ہیں پس قطع نظر اس سے کہ راحت کے شائبوں سے حق تعالیٰ منزہ اور مقدس ہے راحت طلبی واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ یہ ساتواں دن اگر فراغ تھا تو تخلیق عالم سے فراغ کا تھا نہ کہ عالم سے فراغ کا۔ اندریں صورت جب عالم کی کل مدت سات دن ہوئی اور یہی مدت تخلیق عالم پر صرف ہوئی تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کل کا کل زمانہ تخلیق عالم پر صرف کر دیا گیا۔ اس لئے اگر ہم مجموعۂ عالم کی کل عمر ہی سات دن کہیں اور اسی مدت کو پورا زمانہ کہیں تو بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ فرق اتنا ہے کہ تخلیق عالم پر یہ سات دن بلا تکرار کے گذرے جس سے تخلیق کی مدت محدود رہی اور بقاء عالم پر یہی سات دن تکرار کے ساتھ گذر رہے ہیں جس سے عالم کی عمر دراز ہو گئی ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اور کتنی دراز ہو گی۔ یہ بحث الگ ہے جس سے ہمارے موضوع کا کوئی تعلق نہیں کہ اس عالم کا ایک دن ہمارے اس عالم کے ہزار برس کی برابر ہے اور

وہ ایک دن اس سورج کی گردش سے نہیں بنتا بلکہ کسی اور گردش سے وجود پذیر ہوتا ہے لیکن اس سے ہمارے اس دعوی میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زمانہ کی کل مدت ایک ہفتہ ہے جو سات دن کا ہوتا ہے خواہ وہ دن بڑا ہو یا چھوٹا۔ بہر حال حاصل مدعا یہ نکلا کہ مادی رات دن مادی سورج بناتا ہے اور اسی کے طلوع و غروب سے زمانہ بنتا ہے جس کے کل سات دن اور سات راتیں ہیں۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت نے اپنے روحانی طلوع و غروب سے جو زمانہ بنایا وہ بھی سات دن اور سات راتوں کا ہے۔ یہی سات دن اور سات راتیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام اور اس کے کاموں پر آتی رہتی ہیں جس سے اس کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور یہ سات دن اساسی اور بنیادی ہیں جس سے اسلام کا کوئی نہ کوئی عظیم حادثہ اور فطری انقلاب متعلق ہے گویا ان ایام سے ایسے فطری حوادث اور واقعات متعلق ہیں جو اصولی طور پر دنیا میں لوٹ لوٹ کر آتے رہیں گے اور دنیا کی مہم امور کی تشکیل کرتے رہیں گے اس لئے یہ شرعی ایام کا ہفتہ نوعی طور پر کسی ایک قرن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکرار کے ساتھ اسلام کے ہر ہر قرن پر آتا رہے گا۔ سو اسے یوں سمجھو کہ آفتاب نبوت نے جب سب سے پہلا طلوع کیا جسکو ہم جسمانی طلوع کہتے ہیں یعنی آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے اسلام کا پہلا دن بنا جسے ہم یوم الولادۃ کہیں گے۔ پھر اس نے روحانی حیثیت سے طلوع کیا۔ (جبکہ آپکو نبوت ملی) تو اسلام کا دوسرا دن بنا جسے ہم یوم البعثت کہیں گے۔ پھر اس نے روحانی پھیلاؤ کی حیثیت سے طلوع کیا جبکہ آپ نے قوم کو جمع کر کے پیغام حق سنایا اور اپنی نبوت کا اعلان کیا) تو یہ اسلام کا تیسرا دن بنا جسے ہم یوم الدعوۃ کہیں گے۔ پھر آفتاب نبوت سے استوار اور

تمکین کی حیثیت سے طلوع کیا جس سے اس کی روشنی جماؤ کے ساتھ دلوں پر پڑ سکے (جبکہ آپ نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کو مستقر بنایا) تو اس سے اسلام کا چوتھا دن بنا جسے ہم یوم الھجرۃ کہیں گے۔ پھر اس نے تشدد و مدافعت کی تیز روشنی کے ساتھ طلوع کیا (جبکہ آپ کو قتال اور جنگ کی اجازت دی گئی) تو اس سے اسلام کا پانچواں دن بنا جسے ہم یوم القوۃ کہیں گے پھر اس نے غلبہ و اقتدار کی جہت سے طلوع کیا (جبکہ مکہ اور دوسرے لفظوں میں عرب آپ کے دست مبارک پر فتح ہوا) تو اس سے اسلام کا چھٹا دن بنا جسے ہم یوم الشوکۃ کہیں گے۔ پھر اس نے تکمیل مقصد اور اختتام کار کی حیثیت سے طلوع کیا (جبکہ آپ پر یہ آیت کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی) تو اس سے اسلام کا ساتواں دن بنا جسے ہم یوم الاکمال کہیں گے اور اسی کا نام یوم الوداع اور یوم الآخر بھی رکھا جا سکتا ہے پس جس طرح مادی آفتاب نے سات دن بنائے۔ یوم السبت[۱]، یوم الاحد[۲]، یوم الاثنین[۳]۔ یوم الثلثاء[۴]۔ یوم الاربعاء[۵]۔ یوم الخمیس[۶]۔ یوم الجمعۃ[۷] جو دنیا کی پوری عمر ہیں کہ وہی لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں اور دنیا اور اس کے حوادث کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے ایسے ہی آفتاب روحانی نے بھی سات ہی دن بنائے۔ یوم الولادۃ[۱]۔ یوم البعثت[۲]۔ یوم الدعوۃ[۳]۔ یوم الھجرۃ[۴]۔ یوم القوۃ[۵]۔ یوم الشوکۃ[۶]۔ یوم الاکمال[۷]۔ یہی سات دن اسلام اور اسلامی مہمات پر لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں جن سے اسلام کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور اس کی تاریخ بنتی رہتی ہے۔ گویا تاریخ اپنے کو دوہراتی رہتی ہے اور عالم کے حوادث باہم متشابہ اور ایک دوسرے سے

ملتے جلتے رنگ میں ہویدا ہوتے رہتے ہیں گو ہر دور میں رنگ ان کا جدا جدا ہو
یہاں سوال ہوگا کہ یوم ولادت لوٹ کر کہاں آتا ہے ایسے ہی یوم بعثت اور یوم فتح مکہ یوم اکمال وغیرہ تو وہ ایام ہیں جو دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں یہ بعد کے قرون میں کیسے لوٹ سکتے ہیں کہ ان کا تکرار تسلیم کیا جائے؟

جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ یہ ایام اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن اگر ان کی عمومی روح کو دیکھا جائے تو یہ ایام معیاری حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے ہر دور میں آئے اور آتے رہیں گے۔ کیونکہ جسمانی ولادت شریفہ کی روح مرکزی شخصیت کا تعین ہے جس سے اصلاح کا کام لیا جائے۔ روحانی ولادت (بعثت) کی روح نصب العین کا تعین ہے جسے عالم میں چلایا جائے۔ دعوت کی روح نصب العین کا اعلان ہے جس سے عالم کی اصلاح متعلق ہو۔ ہجرت کی روح مستقر اور فتنہ سے دور مرکزی مقام کا تعین ہے جس سے نصب العین دلوں تک پہونچ سکے۔ قوت کی روح نصب العین کو طاقتور بنانا ہے تاکہ دل اس کے سامنے جھک سکیں۔ شوکت کی روح غلبہ و اقتدار ہے جس سے نصب العین کی ضد مغلوب و مقہور ہو جائے۔ اکمال کی روح نصب العین کی تکمیل ہے جس سے کسی کو گریز کا موقع باقی نہ رہے۔ اگر ان سات ایام کی مذکورہ ارواح اور اصولی حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایام دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ بطفیل نبوت ہر قرن میں ہر اہم اور اجتماعی نصب العین کے لئے ان ہی اصولوں کی اور بالفاظ دیگر انہی ایام کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اگر کسی انحطاط کے دور میں خود پورے اسلام یا اس کے کسی دینی یا سیاسی شعبہ کو

کسی تحریک کی صورت میں اٹھایا جائے گویا کوئی مجدد تجدید کے لئے کھڑا ہو تو اسے انہی سات مراحل سے گذرنا پڑیگا۔ مرکزی شخصیت کا تعین، نصب العین کا تعین، نصب العین کی اشاعت، نصب العین کے لئے مرکزی مقام کا تعین، نصب العین کے لئے وسائل قوت کی فراہمی، نصب العین کے لئے حصول غلبہ واقتدار، نصب العین کی علمی اور عملی تکمیل۔ اور جبکہ یہی سات باتیں ان سات ایام کی اصولی روح ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصب العین کو ان سات دنوں سے گذرنا پڑیگا۔ دوسرے الفاظ میں مثلاً تجدید واحیائے دین کے لئے کوئی مقدس شخصیت کھڑی ہو وہ کام کو ابتدائی خاکہ سے شروع کرے پھر اس کی معنویت سمجھائے، پھر اس سے دینی انقلاب رونما ہو پھر اس پر دل ٹھیریں اور مطمئن ہوں پھر اس کا غلبہ ہو۔ اور آخر کار مقصد کی تکمیل ہو کر مجدد کا کام ختم ہو جائے۔ اس صورت سے ایک مجدد کو بہر حال اس ہفتۂ شرعی سے گذرنا پڑا گویا وہ ایک دن پیدا ہوا۔ ایک دن نمایاں ہوا۔ ایک دن اس نے دعوت دی۔ ایک دن مستقر بنایا۔ ایک دن وسائل قوت مقصد فراہم کئے۔ ایک دن غلبہ حاصل کیا اور ایک دن مقصد مکمل کر کے قوم کے ہاتھ میں دیدیا تو وہی سات دن ولادت بعثت دعوت ہجرت قوت فتح اور اکمال اس پر سے گذر گئے پس اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ یہ ایام اپنی اصولی اور کلی حیثیت سے دور نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی کسی نصب العین کو تحریک کی صورت میں لایا جائے گا اور رجال کار کھڑے ہوں گے تو انھیں انہی سات دنوں سے گذرنا پڑیگا۔ اور یہی سات مرحلے کسی اصولی مہم کے آغاز وانجام اور ارتقاء کے لئے

ضروری ہوں گے اس لئے حاصل مدعا یہ نکل آیا کہ آفتاب نبوت نے بھی مادی آفتاب کی طرح اپنا زمانہ خود بنایا اور وہ بھی سات ہی دن کا۔ ایک ہفتہ ہے جو قیامت تک لوٹ کر آتا رہیگا جس سے اسلام اور اس کے کلی اور جزوی مقاصد کی تبلیغ و تحریک ان ایام سے گذرتی رہیگی اور اسلام کی عمر دراز ہوتی رہے گی ورنہ اس کی اصلی عمر وہی سات دن ہیں جنھیں ہفتہ نبوت کہنا چاہیئے۔

آفتاب نبوت کی مقدس راتیں ہاں پھر جیسے مادی آفتاب کے دنوں کیساتھ راتوں کا آنا بھی حکمت و مصلحت تھا چنانچہ اس کے طلوع سے دن بنتے تھے اور غروب سے راتیں اور اس لئے طلوع و غروب کی منزلیں رکھی گئیں ایسے ہی آفتاب نبوت کے بنلائے ہوئے ہفتہ میں بھی دنوں کے ساتھ راتوں کا وجود عین حکمت و مصلحت تھا اور اس لئے یہاں بھی طلوع و غروب رکھا گیا تاکہ طلوع سے شرعی دن بنیں اور اس کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر شرعی راتیں نمایاں ہوں پس جیسے بتصریح حدیث نبوی مادی آفتاب غروب ہو کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور آنے والے دن کے لئے طلوع کی اجازت چاہتا ہے اسے اجازت ملتی ہے اور وہ اس اذن و اجازت کی روشنی اور طاقت سے طلوع ہو کر عالم کو منور کر دیتا ہے اسی طرح آفتاب نبوت بھی بارگاہ خداوندی میں پہنچکر رکوع و سجود، قیام و تشہد اور ذکر و فکر کے ذریعہ رب العرش سے کمالات ظاہر و باطن کا نور لمحہ بلمحہ ترقیات کیساتھ حاصل کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ طلوع ہو کر دن بنائے اور آنیوالے دن میں حاصل کردہ نور سے عالم کو منور کرے۔ پس وہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور عرش کے مالک سے اجازت خواہی ہوتی ہے۔ اور

یہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور رب العرش سے آئندہ کی رفتار اور گفتار کے بارہ میں اذن طلبی کی جاتی ہے فرق اگر ہے تو یہ کہ مادی سورج غروب کے وقت زمین کے نیچے جاتا ہے اور شاید عرش عظیم کے نچلے حصہ کے سامنے ہو کر سجدۂ عبودیت بجالاتا ہے اور یہ روحانی سورج غروب کے وقت زمین ہی نہیں آسمانوں سے بھی بالا ہو کر عروج کرتا ہے اور عرش کے اوپر والے حصہ کے سامنے رب العرش کے آگے جھکتا ہے یعنی آپ کی روحانیت کو عروج ہوتا ہے اور وہ مخلوق سے منقطع ہو کر خالق میں محو اور مستغرق ہو جاتی ہے۔ مادی آفتاب کا عروج زمین کے دائرہ میں ہے اور روحانی آفتاب کا عروج آسمانوں کے دائرہ سے اوپر لامکان میں ہے۔ مادی سورج میں مادیات کی طرف آنا عروج اور عرشیات کی طرف جانا نزول ہے۔ اور یہاں روحانیات کی طرف بڑھنا عروج اور مخلوقات کی طرف آنا نزول ہے یعنی اپنے بلند و بالا مرتبہ سے فروتر ہو کر مخلوق میں ملنا اور اس کی اصلاح کرنا نیچے اترتا ہے اوپر چڑھنا نہیں ہے۔ بہرحال یہ غروب اور راتیں بنانا بھی نبوت کی مختلف شانوں کے لحاظ سے ضروری تھا۔ پس نبوت کے ایام آفتاب نبوت کی افادی شانوں کا ظہور ہیں جن میں وہ کائنات کو علم کی روشنی اور اخلاق کی گرمی پہنچاتا ہے اور نبوت کی راتیں آفتاب نبوت کی استفادی شانوں کا ظہور ہے جنہیں علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حق تعالیٰ سے حاصل کر کے اس کے اونچے درجات خود طے کرتا ہے تاکہ افق انسانیت پر طلوع کر کے ساری کائنات کو علم و اخلاق سے چمکا دے۔

مگر جیسے مادی آفتاب کے غروب سے سات راتیں بنتی ہیں ایسے ہی روحانی آفتاب نے

بھی نگاہوں سے اوجھل ہو کر یا غیبت کے مقام پر پہنچکر ہفتۂ نبوت کی سات ہی راتیں بنائیں جو انفرادی ترقیات کے لئے ضروری تھیں۔ پس آفتاب نبوت کا ایک غروب تو دنیا سے رخصت ہو کر پردہ کر لینا ہے وہ آخری اور انتہائی غروب ہے اور ایک جزوی غروب ہے جو حیات ناسوتی میں پیش آتا ہے سو اس کی حقیقت اس عالم سے غیبت یا عالم بالا کی طرف کمال توجہ ہے جس کے معنی اس عالم سے ہنگامی طور پر پردہ کر لینا ہے۔ اور جیسے ہفتۂ زمانہ کی ابتدا رات سے ہوتی ہے اور دن اسی میں سے کھینچکر نکال لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہفتۂ نبوت کے زمانہ کی ابتدا بھی رات ہی سے ہوتی ہے جس میں سے دن سر نکال کر اپنا روشن چہرہ دکھلاتا ہے۔ چنانچہ آفتاب نبوت کے ابتدائی طلوع (بعثت) سے پہلے جو رات آئی وہ ذات نبوی کی پیغمبرانہ استعداد کی پہلی رات تھی جو چند راتوں کا مجموعہ ہے جس میں کثرت عبادت آپکا جذبہ تھا یَتَحَنَّثُ اللَّیَالِیَ ذَوَاتِ العدد (آپ کئی راتوں میں عبادت میں منہمک اور مستغرق ہوئے) اور انہی میں آخر کار وہ سچے خوابوں کی رات آئی جس میں نبوت کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی اور جو خواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کے پو پھٹنے کی طرح واقعہ بن کر سامنے آجاتی اسے لیلۃ البدایہ کہنا چاہئے کیونکہ اسی کے لئے حدیث اول ما بُدِئَ بہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الرؤیا الصادقۃ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی ہے) میں بدایت اور اولیت کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے جس سے بدایۃ کا لفظ لیا گیا۔ اس رات کے بعد آفتاب نبوت طلوع ہو گیا اور شریعت کا پہلا دن نکلا۔

اس کے بعد غروب ہو کر عالم غیب کی طرف بڑھا تو وہ رات آئی جسمیں

آفتابِ نبوت میں اس مشاہدہ کا نور بھر اگیا کہ وحی الٰہی کا مجموعہ لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر لایا جا رہا ہے اس کے جلو میں ملائکہ کی مقدس جماعتیں نازل ہو رہی ہیں اور عالم غیب کی برکتیں سمٹ کر قلبِ مبارک پر اُتر رہی ہیں۔ اسی رات کا نام لیلۃ القدر[۲] ہے۔

پھر آفتابِ نبوت نے ایک اور غروب کیا تو وہ رات آئی جس میں ایک اور مشاہدہ کا نور آفتابِ نبوت میں بھر اگیا اور وہ یہ کہ حوادث عالم کی حدود اور مقداریں متعین ہو رہی ہیں۔ عمریں۔ رزق اور مخلوق کے تقدیری حصے مشخص کئے جا رہے ہیں اور دفتر قضا و قدر میں مادی اور روحانی نظاموں کے خاکے بن بن کر ملأ اعلیٰ میں پہونچ رہے ہیں اس رات کا نام لیلۃ البراءۃ[۳] ہے۔

پھر آفتابِ نبوت کا ایک اور غروب ہوا اور وہ رات آئی جس میں اجتماعی امور کی عظیم استعداد کا نور آپ میں بھر اگیا اور اس کی مرکزیت کی قوتوں کا مشاہدہ قلب صافی میں ڈالا گیا تاکہ حج کے دنوں میں اس اجتماعیت کبریٰ کا ظہور ہو اس رات کا نام لیلۃ العرفہ[۴] ہے۔

پھر یہ روحانی سورج ایک دفعہ اور غروب ہو کر عالم غیب میں پہنچا تو وہ رات آئی جس میں ان ساری روحانی قوتوں کی تجدید اور بار بار کی تقویت سے ان کو قوی تر ہوتے رہنے کی طاقت عطا کی گئی اس رات کا نام لیلۃ الجمعۃ[۵] ہے۔

پھر آفتابِ نبوت نے ایک اور غروب کیا جس میں ان تمام عطا کردہ روحانی اور مادی نظاموں کے مخالف فتنوں کے مشاہدہ کی قوت عطا کی گئی تاکہ نظام کے منافی امور کے دفاع کی قوت ذہن میں قائم ہو۔ اس رات کا نام لیلۃ الفتن[۶] ہے

جس کے بارے میں حدیث میں اشارہ کیا گیا۔ ماذا انزل اللیلۃ من الفتن
ایقظوا صواحب الحجر رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ الخ (آج
کی رات کتنے فتن نازل ہوتے نظر آرہے ہیں اے حجروں کے رہنے والیوں (ازواج
مطہرات) جاگو (اور طاعت و عبادت میں لگو لباس و زینت کی نمائشوں میں مت الجھو)
دنیا میں بہت سی پہننے اوڑھنے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی)

پھر آفتاب جہانتاب نبوت نے ایک اور غروب کیا اور وہ رات آئی جس میں
اس آفتاب کی گردشوں کے تمام عروجی مقامات دکھلا کر بالآخر نور مطلق کے عالم میں
مستغرق ہونیکا شرف دیا گیا جس سے نور نبوت اپنی انتہائی شدۃ و قوت پر پہنچگیا
اور نورانیت کا وہ مقام رفیع سامنے لے آیا گیا جس تک اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی
ستارے کی پہونچ نہ ہوسکی تھی۔ اور خصوصیت سے آپ کو عبدیت کے مقامات طے
کرا کر عبداللہ کا رفیع المنزلت خطاب بھی عطا کر دیا گیا اور آخر کار ہر قسم کے روحانی
اخلاقی اور سیاسی نظاموں کا وہ خاکہ دکھلا دیا گیا جس کے مطابق زمین پر اس
آفتاب نبوت کی روشنی میں ایک نظام صالح برپا کرانا منظور تھا اسی رات کا نام
لیلۃ الاسراء اور لیلۃ المعراج ہے۔ اسے ہم لیلۃ النہایۃ بھی کہہ سکتے ہیں
جس میں قربات نبوت کو انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ یہ ساتوں راتیں نبوت کے ساتوں
دنوں کی ساتھ لازم ملازم ہیں۔ اور جس طرح ایام نبوت لوٹ لوٹ کر ہر دور میں آئے
اور آتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی یہ راتیں بھی ہفتۂ نبوت کی تکمیل کے لئے کمر بستہ گرد آتی
رہتی تا گزیر ہیں۔ کیونکہ یہ راتیں گو اپنی سطح کے لحاظ سے دور نبوت کے ساتھ مخصوص
نظر آتی ہیں لیکن اپنی اصولی روح اور عمومی مقاصد کے لحاظ سے وہ اسلام کے ہر دور

اور ہر دور کے ہر مقاد کے لئے عام ہیں کیونکہ لیلۃ البدایۃ کی روح ذہنی استعداد کی تکمیل ہے۔ لیلۃ القدر کی روح ذہنی استعداد کا انبساط اور رگ رگ پے میں اس کا اتر جانا ہے۔ لیلۃ البراءۃ کی روح حوادث عالم کے اندازوں سے ذہنی ہم آہنگی ہے۔ لیلۃ العرفۃ کی روح ان حوادث کی اجتماعی شانوں کی ذہن نشینی ہے۔ لیلۃ الجمعہ کی روح ان ذہنی قوتوں کی تجدید ہے۔ لیلۃ الفتن کی روح اثناء راہ کے فتنوں اور موانع کے دفعیہ اور سدباب کے طریقوں کو ذہن آشنا بنانا ہے۔ اور لیلۃ المعراج کی روح تقرب الی اللہ کے انتہائی مقامات سے روحانی اور ذہنی شیفتگی اور توجہ الی الخلق کے مقامات سے قلبی وابستگی کی تکمیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر زعیم و قائد اور ہر مصلح و منّاد کو اپنی قائدانہ زندگی اور اپنی ذہنی پختگی کے لئے ان ساتوں مرحلوں سے گذرنا طبعی ہے جس کے بغیر چارہ کار نہیں کہ وہ اولاً اپنی ذہنی قوتوں کو سمیٹے تاکہ جو اصولی خاکہ دنیا کے سامنے لائے وہ منضبط اور مرتب ہو اور اس کی تاثیر مضبوط ہو جو صحیح ترتیب ہی سے مکمل ہوتی ہے۔ پھر ان میں ذہنی انبساط پیدا کرے جس سے تفصیلی پروگرام بنے پھر دنیا کے واقعات کو سامنے لائے تاکہ نفسیات کے مطابق کام آگے بڑھے۔ پھر اجتماعی رنگ کو سمجھے کہ صحیح معاشرہ بنا سکے۔ پھر ہمہ وقت اپنی ذہنی قوتوں کو بار بار تازہ بتازہ بناتا رہے کہ اس کے عمل میں عزم و ثبات پیدا ہو پھر اپنی فروگذاشتوں پر کڑی نظر رکھے تاکہ مخاطبوں کو حرف گیری کا موقع نہ ملے اور کام میں اٹکاؤ پیدا نہ ہو۔ پھر اپنی ذہنی قوتوں کی تکمیل کی طرف بھی ہمہ تن متوجہ رہے کہ دوسروں کے بنانے میں خود اپنے اندر کسی بگاڑ کا اندیشہ نہ رہے۔ اور جبکہ یہ حقیقتیں ہی ان سات راتوں کی روح ہیں جن سے کسی مصلح و مناد کو چارہ کار نہیں تو اس کا قدرتی

نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ سات راتیں ہر مصلح ہر مبلغ ہر قائد اور ہر لیڈر پر فطرۃً گذرنی ضروری ہیں ورنہ کار اصلاح پورا نہیں ہو سکتا پس شرعی دنوں کی طرح یہ شرعی راتیں بھی لوٹ لوٹ کر قیامت تک آتی رہیں گی اور ہفتۂ نبوۃ اپنے دن و رات سمیت حرکت اور تکرار میں رہے گا جس سے واضح ہو گیا کہ جس طرح مادی آفتاب نے اپنی گردش سے ایک ہفتہ بنایا جو پورے عالم کی عمر تھا جسے ہفتۂ دنیا کہنا چاہئے اسی طرح آفتاب روحانی نے بھی اپنی تشریعی نقل و حرکت سے ایک ہفتہ بنایا جو پورے اسلام کی عمر تھا جسے ہفتۂ نبوت یا اس کی اندرونی عمومیت کی جہت سے اسے ہفتۂ اسلام کہنا چاہئے ہفتۂ دنیا کے تکرار سے دنیا کی عمر دراز ہوتی ہے اور اس ہفتۂ اسلام کے تکرار سے اسلام کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ اس سے معاشی زندگی مکمل ہوتی ہے اور اس سے معادی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

نظام زمانی | ہاں پھر جبکہ آفتاب نبوت کے بنائے یہ ایام انہی مادی ایام پر منطبق ہیں یہ نہیں کہ آفتاب نبوت نے کوئی زمانہ اس زمانہ سے الگ کسی اور عالم میں بنایا ہے بلکہ انہی ایام کا رخ پھیر کر انہیں مادی سے روحانی کر دیا ہے۔ اور جہاں بھی آفتاب نبوت کی نسبت ان ایام اور ان کی راتوں میں لگتی گئی ہے وہی مقدس اور متبرک ہوتے گئے ہیں۔ نیز جن جن اوقات کو آفتاب نبوت نے اپنے روشن اعمال و وظائف کا ظرف بنا لیا ہے وہی پاک اور مطہر ہوتے چلے گئے ہیں اس لئے یہ ہفتۂ نبوت تو ایک کلی زمانہ ہے جو پورے مادی زمانہ پر حاوی ہے یعنی جیسے مادی آفتاب کا بنایا ہوا کل زمانہ ہے جس میں وقت کی لاکھوں کروڑوں ساعتیں آئی ہوئی ہیں ایسے ہی آفتاب نبوت کا یہ بنایا ہوا اسلام کا ہفتہ کل زمانہ ہے جس میں

کروڑوں ایمانی دن اور مقبول ساعتیں، لاکھوں ایام اور ہزارہا مہینے اور سال شامل ہیں جس سے واضح ہوا کہ مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب کا بھی ایک نظام ہے کہ اس ہفتۂ اسلام میں اپنے اپنے محل اور موقعہ پر ضمنی رات اور دن آتے رہتے ہیں مہینے اور سال شروع اور ختم ہوتے رہتے ہیں، ساعتیں اور دقیقے اپنی اپنی جگہ وضع ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح کل زمانہ ہی نہیں بلکہ اس کے ضمن میں جزوی اوقات بھی اس نظام کے تحت مقدس ہوتے گئے ہیں اور انجام کار آفتاب نبوت نے اس مادی آفتاب کے پورے ہی زمانہ پر قبضہ کر کے اسے اپنے نظام میں لے لیا ہے۔ مثلاً کہیں تو آفتاب نبوت نے اپنے وظائف کے لئے نظام شمسی کو اپنایا ہے جو بلا واسطہ مادی آفتاب کا قائم کیا ہوا نظام ہے اور کہیں نظام قمری کو اختیار کیا ہے جو بالواسطہ مادی آفتاب کا برپا کیا ہوا نظام ہے مثلاً لیلی اور نہاری یعنی رات دن کی عبادتوں میں جن میں گھنٹے اور منٹ صرف ہوتے ہیں آفتاب نبوت نے نظام شمسی کو معتبر قرار دیا گویا سورج کے حسی نظام میں اپنا روحانی اور معنوی نظام داخل کر کے اسے اپنا لیا ہے جیسے نمازوں کے اوقات کا حساب آفتاب کی نقل و حرکت سے متعلق ہے بعض نمازوں کے اوقات اس کے طلوع وغروب سے متعلق ہیں جیسے فجر و مغرب بعض کا تعلق اس کی مقدار حرکت سے ہے جیسے ظہر و عصر بعض کا تعلق اس کے آثار سے ہے جیسے عشا کہ غروب شفق سے اس کا وقت آتا ہے یا اسی طرح صبح و شام کے اذکار نظام شمسی سے ہی متعلق ہیں جیسے تسبیحات صبح و شام کہ یہ اوقات ذکر و نماز کا وقت ہو جانے سے مقدس بن گئے ہیں۔ اندر زمانہ کا ایک بڑا حصہ آفتاب روحانی کے نظام میں داخل ہو گیا۔

ادھر اسی نظام کے تحت ماہ و سال کی عبادتوں میں نظام قمری کا اعتبار کیا جو

بالواسطہ سورج ہی کا نظام ہے۔ کیونکہ چاند میں سورج ہی کا نور کام کرتا ہے۔ چنانچہ حج کے مہینوں کا تعین یعنی شوال، ذی قعدہ اور عشرۂ ذی الحجہ (تقریباً ڈھائی ماہ) وجوب زکوٰۃ کے لئے بارہ ماہ، روزوں کے ایام کا ایک ماہ، یا چلہ کشی مثلاً اربعین موسوی کا سوا ماہ، یا مدت ایلاء کے چار ماہ "یا عدت طلاق کے تین حیض گویا تین ماہ" یا عدت وفات زوج کے چار ماہ دس دن لے کر آفتاب نبوت نے زمانہ کے ایک اور عظیم حصہ کو گھیر لیا ہے

پھر اسی نظام روحانی کے ماتحت مخصوص عبادتوں کے مخصوص ایام جیسے اخیر عشرۂ رمضان کی دس راتیں یا اول عشرۂ ذی الحجہ کے دس دن یا دوسرے عشرۂ ذی الحجہ کے ابتدائی تین دن جنھیں ایام تشریق کہتے ہیں یا ہر ہفتہ کے پیر اور جمعرات کا دن جن میں بنی آدم کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں۔ یا ایام جمعہ کہ انھیں نظام قمری سے لیکر نظام روحانی میں شامل کر لیا گیا اور زمانہ کے ایک اور حصہ پر آفتاب نبوت کا قبضہ اور نظام قائم ہو گیا۔

پھر اسی روحانی نظام کے ماتحت وقت کی بہت سی ساعتیں اور گھڑیاں اوپر لے لی گئیں جیسے ساعت شب قدر ساعت جمعہ اور ہر رات دن میں ایک ساعت جس میں قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا ہے یا نمازوں کی جماعت کھڑے ہونے کی گھڑی یا جہاد شروع کرنے اور یلغار کر کے بڑھنے کی ساعت یا دو مسلمانوں کے محبت سے ملنے اور مصافحہ کرنے کی ساعت یا تہجد میں اٹھنے اور نماز پڑھنے کی ساعت جنمیں حق تعالیٰ نے اپنی خوشی اور بعض ساعتوں میں اپنی ہنسی کی خبر دی ہے ظاہر ہے کہ یہ مہینے اور ایام اور گھنٹے اور ساعتیں محض اس لئے مقدس بن گئے کہ وہ مختلف عبادتوں کے لئے بطور ظرف کے لے لئے گئے۔ اور اس طرح زمانہ کے ایک اور بڑے حصہ پر آفتاب نبوت کا نظام قائم ہو گیا اور یہ اوقات اس کے اوقات کہلائے۔ گویا مادی چاند سورج کے نظام

کی ساتھ ساتھ ایک مستقل اور متوازی نظام آفتاب روحانی کا بھی آمیز ہو دیا گیا ہے
پھر اسی روحانی نظام اوقات کے تحت آفتاب روحانی نے بعض ایسے مقبول اوقات کی بھی اطلاع دی ہے جو کسی ایک مقررہ ساعت میں نہیں آتے اور متعین بھی نہیں ہیں۔ مگر ہر ہر ساعت میں ان کے آنے کا احتمال بتلا کر ایک حد تک پورے ہی زمانہ کو مقدس بنا دیا ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ۔

الا ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لھا۔ آگاہ رہو کہ تمہارے ان رات دن کے اوقات میں تمہارے پروردگار کی طرف سے مقبولیت کی کچھ ہوائیں چلتی ہیں۔ دیکھو ان کی جستجو میں لگے رہو اور انھیں ڈھونڈتے رہو (ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت سے وہ مقبول گھڑیاں نکل جائیں اور تم محروم کے محروم رہ جاؤ۔)

اس حدیث نے زمانہ کی ہر ہر ساعت میں عبادت کے سبب تقدس اور مقبولیت کا احتمال پیدا کر کے گویا سارے زمانہ ہی کو روحانی نظام کے تحت میں لے لیا اور مقدس بنا دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت آفتاب نبوت سے ہی کی کشش کا ثمرہ ہے اس لیئے یہ پورا زمانہ عبادت کا ظرف ہو جانے کی وجہ سے آفتاب نبوت کا بنایا ہوا زمانہ کہلائے گا اور اس کا ہو جائے گا بلکہ عملی طور پر دیکھا جائے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لحظہ اور ہر ہر منٹ ذکر و طاعت میں مصروف رہتا تھا یعنی آپ نے اپنی سیرت پاک سے اپنے کل زمانہ کو عملاً مقدس بنا کر دکھا دیا چنانچہ ارشاد حدیث ہے کہ

کان یذکر اللہ علے کل احیان۔ آپ ہر لمحہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔

اور فرمایا۔

کان دائم الفکرۃ حزیناً — آپ تمام اوقات متفکر اور غمگین رہتے تھے (خوف خداوندی اور فکر آخرت میں)

بہر حال زمانہ کے یہ وہ حصے ہیں جو شریعت نے خود اپنے انتخاب اور اپنے اختیار سے اپنے نظام میں شامل کر کے اپنے لئے خاص کر لئے خواہ تعین کے ساتھ یا بلا تعین عمومی احتمال کے ساتھ لیکن اسی کے ساتھ وقت کے وہ طویل وعریض حصے جو شریعت نے تخصیص کے ساتھ خود منتخب نہیں کئے۔ نہ تعین خاص سے نہ احتمال عمومی سے بلکہ ان میں بنی آدم کو اختیار دیدیا ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے انھیں عبادت و طاعت کے لئے بطور ظرف کے منتخب کر سکتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان اوقات میں بھی روحانی نظام میں شامل ہو جانے اور مقدس بن جانے کی صلاحیت ہے۔ مگر وہ عباد صالحین کے انتخاب و اعمال سے ظاہر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ان مقدس وظائف سے انھیں معمور کر لیں۔ اسمیں نوافل، تلاوت، اذکار، جہاد، ہجرت۔ نیز اخلاقی قدروں کا استعمال اور ساری ہی اختیاری طاعات آجاتی ہیں جنھیں انسان ان غیر مقررہ اوقات میں باذن خداوندی اپنے اختیار سے خود بھی مقدس اور مقبول بنا سکتا ہے اور اس طرح زمانہ کا ایک اور بڑا حصہ نظام روحانی کے تحت میں آجاتا ہے اور اس طرح تقریباً کل زمانہ بالفعل اور بالقوت عباداتی افعال کا ظرف بن جانے کی وجہ سے مقدس اور آفتاب روحانی کے نظام میں شامل ہو جانے کی وجہ سے پاک اور مقبول ہو جاتا ہے جس میں کچھ عبادتیں بامر شریعت انجام دی جاتی ہیں اور کچھ باذن شریعت بندہ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے۔ اس لئے زمانہ کی ہر ہر ساعت ظرف عبادت بن جانے کے سبب خواہ وہ بالقوۃ بنے

یا بالفعل اور بانتخاب شرعی بنے یا بانتخاب عباد مقدس بن کر آفتاب نبوت کی ساعت ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ ساری گفتگو عبادات میں تھی کہ وہ جس زمان و مکان میں واقع ہوتی ہیں اس زمانہ اور مکان کو ظرف عبادت ہو جانے کی وجہ سے مقدس بنا دیتی ہیں۔ اور اس طرح وقت کا ایک عظیم حصہ آفتاب روحانی کے نظام میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کے ساتھ ایک عبادت ہی تو نہیں عبادات اور معاشرت کے افعال کا بھی ایک عظیم لشکر لگا ہوا ہے۔ جیسے کھانا، پینا، سونا جاگنا، آنا، جانا، چلنا، پھرنا، پہننا اوڑھنا، لینا، دینا، ملنا، جلنا، ھنسنا، بولنا، رہن سہن، محبت، عداوت، دوستی، دشمنی، صلح جنگ، معیشۃ و معاشرۃ وغیرہ۔ اور ان میں بھی انسانی زندگی کے وقت کا ایک بڑا حصہ صرف ہوتا ہے جو یقیناً عبادت میں مصروف نہیں ہوتا۔ اور اس لئے بظاہر آفتاب نبوت کے اثرات سے محروم رہ جانے کے سبب بدستور غیر مقدس رہ جاتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس میں بھی آفتاب نبوت کے زمانہ کا وہی شرعی نظام سمایا ہوا ہے اور وہ اس طرح کہ گو یہ افعال فی نفسہ عبادت نہیں مگر اسلام نے انہیں بھی حسن نیت اخلاص اور اتباع سنت کے راستہ سے عبادت بنا دیا ہے اس لئے جو شخص بھی شرعی نیت سے انہیں انجام دے گا وہ عبادت بن جائیں گے۔ اور زمانہ کے جس حصہ میں بطور عبادت واقع ہوں گے اسی کو مثل شرعی اوقات کے مقدس اور مقبول بنا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد عمر کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں بچتا کہ وہ اس روحانی نظام سے باہر رہ جائے۔ اور آفتاب نبوت کے

تعلق سے بے نیاز یا محروم رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جس طرح مادی آفتاب کا نظام تنویر و ضو فشانی پورے زمانہ پر حاوی ہے۔ اس لئے آفتاب نبوت کا نظام روحانی بھی پورے زمانہ پر چھایا ہوا ہے۔ وہاں مادی سورج کی تکوینی نقل و حرکت سے حسی نور کا نظام بنتا ہے اور یہاں روحانی سورج کی تشریعی نقل و حرکت سے معنوی نور کا نظام بنتا ہے۔ اور جس طرح وہ نظام انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اسی طرح یہ نظام بھی اس کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

آفتاب نبوت کے بنائے ہوئے زمانہ سے موسموں کا ظہور!

پھر جیسے آفتاب کی چال سے دن اور رات بنتے ہیں ایسے ہی اس چال کی مختلف وضعوں اور ہیئتوں سے موسموں اور فصلوں کا ظہور بھی ہوتا ہے وہ خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی جانب کو ہو کر چلنے لگتا ہے تو سردی کی آمد ہوتی ہے اور فصل خریف آجاتی ہے۔ اور اگر شمال کی طرف کو ہو کر محو رفتار ہوتا ہے تو گرمی آتی ہے موسم بہار شروع ہوتا ہے اور فصل ربیع کی آمد ہو جاتی ہے۔ پھر ان فصلوں اور موسموں کے اثرات کائنات اور کائناتی اشیاء کے مزاجوں اور نفوس پر پڑتے ہیں۔ موسم بہار میں مزاجوں میں ابھار اور قوتوں میں امنگ ہوتی ہے۔ اور موسم خزاں میں طبائع میں سستی نبات و حیوان میں پژمردگی اور جماد و معدنیات میں یبوست و خشکی کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر انہی مختلف فصلوں کے تقاضوں سے مختلف پھل پھول غلے میوے اور مختلف جڑی بوٹی پیدا ہوتی ہے جن کی تاثیرات جانداروں کے مزاجوں میں نمایاں ہوتی ہیں جس سے تمام مابہ الیداء پیدا شدہ چیزوں میں آفتاب مادی کی تاثیرات نمایاں ہیں یعنی وہ مکان اور زمان ہی میں

مؤثر نہیں بلکہ اعیان میں بھی مؤثر ہے اور ہر زمانی اور مکانی شے بلکہ اس کے اندرون تک میں بھی اس کی تاثیر پہنچی ہوئی ہے خواہ وہ جماد ہو یا نبات حیوان ہو یا انسان۔

پھر موسموں کے تقاضاء سے جب فضاء آسمانی سے بارشیں اترتی ہیں تو زمین کی طرح سمندر اور اس کی مخلوقات میں بھی زندگی آتی ہے۔ ابر نیساں برستا ہے تو سمندری سیپ میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے لعل بدخشانی کی نمود ہوتی ہے۔ اسی سے معدنیات میں ہیرے اور نیلم پیدا ہوتے ہیں جس سے مادی آفتاب کی تاثیر جَو اور فضاء اور زمین کے نیچے اس کے جوف تک میں نمایاں ہے بغرض آسمان کے نیچے جَو اور فضاء زمین کی سطح۔ جوف زمین، سمندر کی سطح اور اس کی گہرائیوں میں آفتابی تاثیرات اپنا کام کرتی رہتی ہیں جس سے عالم کی مصالح برقرار ہیں اور جہانوں کے کارخانے چل رہے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح اس آفتاب روحانی کی شرعی چال سے جیسے روحانی زمانہ، روحانی دن رات اور روحانی ہفتے بنتے تھے ایسے ہی اس سے روحانی فصلوں اور موسموں کا بھی شرعی نظام کے تحت ظہور ہوتا ہے اور وہ موسم اور فصول نمایاں ہوتے ہیں جن سے مختلف معادی اور اُخروی امور کا تعلق ہے نبی کا قرن پاک یعنی خیر القرون۔ مجددوں کی تجدید دین کے زمانے، صلحاء و اتقیاء کے غلبۂ صلاح و رشد کے اوقات روحانی ایام میں موسم بہار کا درجہ رکھتے ہیں قلوب میں انبساط ہوتا ہے تخم سعادت کے نشوو نما پانے کی گھڑیاں نمایاں ہوتی ہیں اور ہر قلب میں شجرۂ ایمان کے اُگ آنے اور برگ و بار لانے کی قریبی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر کس و ناکس اپنے ضمیر میں ایک خیر محسوس کرتا ہے

اور ایمان و عمل صالح خود بخود سعید قلوب میں ابھر آتے ہیں۔ گویا جھوٹ کو بھی اگر خیر کا تخم دل میں گر جائے تو وہ سچ کو کونپل لے آتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں تناور درخت بن جاتا ہے۔ ہاں جب ان زمانوں سے دوری ہوتی ہے تو وہی اس روحانیت کی موسم خزاں ہوتی ہے جس میں دل کملائے ہوئے ہوتے ہیں دین کے لحاظ سے سرد مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ علمی اور عملی قویٰ مضمحل اور سست پڑ جاتے ہیں، فتنوں کا ظہور ہوتا ہے اور امانت گھٹ جاتی ہے۔ اخلاق فاضلہ گم ہو جاتے ہیں۔ اور اخلاق ردیّہ کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ کفر و بغاوت ادبھرتی ہے، سرکشی اور بے حیائی نمایاں رہتی ہے۔ غرض کسی رات دن میں۔

سیروا فیھا لیالی وایاما آمنین۔ — اس زمین میں راتوں اور دنوں مامون ہو کر چلو پھرو۔

کا ظہور ہوتا ہے جو دور امانت ہوتا ہے اور کسی زمانہ میں

فی یوم نحس مستمر (ایسے دن میں جو ہمیشہ نحس ہوگا)

اور فی ایام نحسات اور منحوس دنوں میں)

کا ظہور ہوتا ہے جو دور فتن ہوتا ہے۔ پہلا موسم روحانی بہار کا ہے اور یہ دوسرا روحانی خزاں کا۔

پس اگر مادی آفتاب سردی کا موسم لاتا ہے جس میں فصل ربیع کی آمد ہوتی ہے اور وہ پھل پھول کا زمانہ ہے تو یہی شرعی فصل ربیع کا بھی وقت ہوتا ہے جسے آفتاب نبوت اپنے روحانی تصرف سے برپا کرتا ہے جس میں روحانی پھل پھول اُگتے ہیں یعنی سردی کی رات لمبی رات ہوتی ہے تو تہجد اور قیام لیل نیند کے قانون

کے لئے بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ

الشتاء ربیع المؤمن — سردی کا موسم مومن کیلئے فصل ربیع کا زمانہ ہے

یا اسی لئے زمانۂ نبوی کو خیر القرون فرمایا گیا جس میں نور نبوت اور نور صحابیت چمک کر خیر و شر کا راستہ واضح کر دیتا ہے اور زمانۂ تابعین کو خیر کہا گیا مگر دوسرے درجہ میں گویا یہ سب موسم بہار کے اعلیٰ و ادنیٰ حصے ہیں جن میں خیر اور روحانیت دنیا پر غالب ہوئی۔ بعد کے قرون خزاں کے ہوئے تو مجددوں کو مثل ابر باراں کے بھیجا جاتا ہے جس سے دلوں کی مردہ زمین پھر زندہ اور ہری بھری ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے مادیات میں ہر موسم کا پھل پھول الگ الگ ہوتا ہے۔ کسی موسم میں آم کسی میں سیب و سنترہ اور کسی میں انگور و انار اور خرما وغیرہا ایسے ہی ان روحانی فصلوں کے گل و گلزار اور پھل پھول بھی الگ الگ ہیں۔ کسی موسم میں آفتاب نبوت کی تاثیر سے شرعی پھل پھول اگتے ہیں کسی مجدد کے دور میں قرآنی تجلیات دیانات کے رنگ میں ہوتی ہیں۔ کسی دور میں سیاسی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ کسی دور میں عمل کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور کسی دور میں علم و استدلال اور حجت و برہان کی افزائش ہوتی ہے کسی دور میں رنگ تجدید صوفیانہ ہوتا ہے اور کسی میں متکلمانہ۔ کسی دور میں املاء حدیث کا دور دورہ ہوتا ہے اور کسی میں فقہ و تفقہ کی گرم بازاری غرض مختلف زمانوں میں مختلف روحانی فصلیں آتی ہیں اور اپنے مناسب حال پھل پھول اور برگ و بار لاتی ہیں اور یہ سب کچھ آفتاب نبوت ہی کی مخفی تاثیرات و تصرفات کا ثمرہ ہوتا ہے جیسا کہ مادی موسموں میں مادی آفتاب ہی کی مختلف تاثیرات نمایاں ہوتی ہیں۔ غرض آفتاب نبوت نے جس ساعت پر اور اس کی جس

وضع اور فصل پر اپنا نورانی سایہ ڈالدیا وہی ساعت مقدس ہوگئی اور اس طرح آفتاب نبوت کا مستقل روحانی نظام ان رات دن کے سارے دوروں اور گردشوں پر پڑا ہوا ہے جس سے اس کی تاثیرات کی ہمہ گیری اور عموم فیضان واضح ہوتا ہے

نام زد ایام پھر ظاہر ہے کہ مادی آفتاب کے بنائے ہوئے یہ رات اور دن جبکہ ظرف ہیں جن میں مختلف کاروبار اور مہمات امور بھی واقع ہوتے ہیں جنمیں بہت سے ایسے تاریخی بھی ہوتے ہیں جو عام دنوں کے لحاظ سے امتیازی شان اور شہرت عامہ رکھتے ہیں یعنی مادی لوگ جب انھیں اپنے کسی اہم اور اجتماعی کام کا ظرف ٹھیرا لیتے ہیں تو یہ ایام اہم شخصیتوں یا ان کے اہم کردار وعمل کی طرف منسوب ہوکر انہی کے نام زد ہو جاتے ہیں انہی کے دن کہلاتے ہیں اور ان دنوں کو اجتماعی طور پر بطور عید کے منایا جاتا ہے۔ جیسے مقتدایان مذاہب کی پیدائش یا وفات یا ان کے کسی تاریخی کارنامہ کے ایام کو انہی حوادث کیطرف منسوب کرکے لوگ انھیں بطور "ڈے" کے مناتے ہیں۔ اور یہ ایام تاریخی طور پر انہی شخصیتوں کے ایام کہلانے لگتے ہیں۔ جیسے ہندوؤں میں "کرشن ڈے" یا مسلمانوں میں "حسین ڈے" یا عیسائیوں میں "یوم مسیح" (بڑا دن) یا سیاسیوں میں "گاندھی ڈے یا تلک ڈے" وغیرہ یا جیسے سیاسی جماعتوں کی آزادی کی جدوجہد کے کامیاب ہونے کے دنوں کو "یوم آزادی" کہکر بطور جشن کے مناتی ہیں یا یوم "جمہوریت" کا نام دے کر دستوری حکومت کا جنم دن مناتے ہیں یا سیاسی کشمکش کے زمانہ میں رضا کاروں کی مظلومانہ موت پر "یوم شہداء" کے نام سے دن منایا جاتا ہے۔ یا کسی بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے دن کو "یوم جشن"

سال کے پہلے دن کو "یوم سالگرہ" کہکر منایا جاتا ہے۔ اور اکثر اس ملک کا تاریخی سن بھی بطور یادگار اسی دن سے شروع کیا جاتا ہے یا سلاطین و امراء کی عمر کے پہلے دن کو ہر سال یوم "سالگرہ" کہکر بطور جشن کے منایا جاتا ہے۔ غرض دن منانا تو آفتاب کا کام ہے مگر کسی اہم اور عظیم کام یا شخصیت کے انتساب کی وجہ سے اسے مادیت پسند لوگ اپنا لیتے ہیں اور اپنے نام سے موسوم کر کے سال بہ سال اسے شہرت دیتے رہتے ہیں۔

لیکن حقیقت پر غور کیا جائے تو کسی عمل کے لیئے دن کی آئینی تخصیص اور انتساب کے ساتھ اسے یوم اجتماع قرار دینا اصل حق نبوت اور آفتاب نبوت کا ہے کہ یہ تخصیص فی الحقیقت دین ہی کے دائرہ کے لیئے وضع ہوئی ہے مادی دنیا نے اس کی نقالی یا سرقہ کر کے حکومتوں یا حکومتی کاموں یا حکومتی شخصیتوں کے لیئے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ تخصیص دینی کاموں یا دینی شخصیتوں میں بھی دین کی اجازت کے بغیر جائز نہ تھی چہ جائیکہ دنیوی کاموں اور شخصیتوں کے لیئے یہ شرعی طریق عمل سرقہ کیا جائے۔ یہ سرقہ اگر دینی وضع کے امور میں برنگ دین کیا جائے اور اسے بطور رسم و رواج استعمال کیا جائے اور اس رنگ سے ان ایام کو دینی یادگار بنایا جائے تو یہ اس لئے مذموم ہوگا کہ یہ ایک شرعی حق میں تصرف اور مصرف کی تبدیلی ہے۔ اور اگر خالص دنیوی قسم کے امور میں استعمال کیا جائے تو یہ دینی ایام کے حقوق میں مداخلت ہوگی جو یقیناً بے جا ہے۔

ہاں اگر ان ایام کو آفتاب نبوت اجتماعی حیثیت دے کر کسی شرعی مہم کے

لئے بطور یادگار اپنے نظام میں لے آئے تو سر تا سر حق ہوگا۔ جیسے رمضان کے تیس دن کے روزوں کے بعد یکم شوال کو "یوم الفطر" کا نام دے کر بطور ڈے کے منایا جانا تجویز کیا اور اسے نماز کی عبادت سے معمور کر دیا گیا یا جیسے موسم حج میں تکمیل مناسک کے ذیل میں ابراہیمی قربانی کے یاد کے طور پر دسویں ذی الحجہ کو "یوم النحر" کہکر بطور ڈے کے رکھا گیا اور اسے نماز اور قربانی کی عبادت سے معمور کر دیا گیا تاکہ ادائے شکر کی علامت ہو۔ یا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے یوم نجات یا یوم آزادی کو جو محرم کے عشرۂ اولیٰ کا آخری دن تھا۔ یوم عاشوراء کہکر بطور یوم خاص کے رکھا گیا اور اسے ابتداءً فرض روزہ سے اور بعد میں نفلی روزہ کی عبادت سے معمور کیا گیا تاکہ اس خوشی کی یاد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے۔ یا جیسے حج جیسی عظیم اجتماعیاتی عبادت کے یوم افتتاح کو "یوم الترویہ" کہکر ایک امتیازی شان دیدی گئی تاکہ اس عبادت کے افتتاح کی اہمیت و عظمت قیامت تک نمایاں ہوتی رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ وہ ایام اللہ ہیں جن کی تذکیر

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيَّامِ اللّٰهِ اور یاد دلائے ایام اللہ کو

کی روشنی میں خاص طور پر کی جاتی ہے۔ بس مذکورہ ایام الدنیا کی تذکیر اہل دنیا ڈے مناکر کرتے ہیں اور ان ایام اللہ کی تذکیر اہل اللہ ڈے مناکر کرتے ہیں مگر ڈے معین کرنا اور منانا حقیقتاً حق شریعت کا ہے۔ اہل دنیا نے نظام دین کے متوازی دنیوی نظام بنا کر ڈے متعین کر کے مداخلت فی الدین کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ اہل دین کے جاہل طبقہ نے دین اور اہل دین کے نام سے از خود ڈے متعین کر کے ان کے منانے کی عیدیں منالیں۔ جیسے گیارھویں کا دن،

دسویں کا دن، تیجہ کا دن، برسی کا دن یا فلاں بزرگ کا دن، صدیق ڈے، فاروق ڈے وغیرہ متعین کر کے دین کے رنگ میں مداخلت فی الدین کی ہے اور یہ چیز پہلے کی بہ نسبت زیادہ قبیح ہے کہ دین میں التباس اور تلبیس پیدا کرتی ہے۔

بہر حال مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب نے اپنا زمانہ خود بنایا لیل و نہار خود وضع کیے۔ ماہ و سال خود تیار کیے، مواسم اور فصول خود بنائے ان میں اپنی نسبتیں خود ڈالیں اور اس طرح پورے زمانہ کے مادی نظام کے دوش بدوش اپنا ہمہ گیر روحانی نظام قائم کر دیا جس سے اس کا فیضان عام مکان سے لیکر زمان تک اور زمان کے سال سے لیکر ماہ و ہفتہ و ساعت تک سب پر منظم طریق پر چھایا ہوا ہے۔ جو آفتاب نبوت کی عالمگیر وسعتوں اور عمومیت فیضان کی کھلی دلیل ہے۔ اور یہ عمومیت مادی آفتاب کی ان عرض کردہ شباہتوں سے جب پایۂ ثبوت کو پہنچی تو بلا شبہ یہ سراج منیر کی دلالت کے نیچے آکر اس آیت کا مصداق ہو گئی فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

آفتاب نبوت اور اجتماعیت کبریٰ

مزید غور کرو تو آفتاب نبوت کا یہ طلوع و غروب جس سے نبوت کے رات دن بنے صورتاً طلوع و غروب ہے ورنہ درحقیقت عروج و نزول ہے جس کی محض صورت طلوع و غروب کی ہے پس آفتاب نبوت نے اگر اس عالم شہود سے عالم غیب کی طرف رخ کیا جسے ہم نے غروب سے تعبیر کیا تھا تو وہ حقیقی غروب نہیں بلکہ عروج تھا۔ مقامات قرب کی طرف۔ اور اگر اس نے عالم غیب سے پھر عالم شاہد کا رخ کیا جسے ہم نے

طلوع کہا تھا تو وہ درحقیقت طلوع نہیں بلکہ نزول تھا خلق خدا کی طرف تاکہ وہ غیبی نور سے فیض یاب ہو۔ اس لئے یہ طلوع و غروب حقیقی نہیں بلکہ یہی عروج و نزول ہے۔ حقیقی طلوع ایک ہی ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری ہے اور حقیقی غروب بھی ایک ہی ہے اور وہ آپ کی عالم بالا کی طرف تشریف بری ہے۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ آفتاب نبوت کے طلوع سے جو دن نکلا وہ ۶۳ برس کا ایک ہی دن تھا۔ جس میں یہ عروج و نزول ہوتا رہا اور اس لئے حقیقی رات اگر ہے تو وہ ولادت و بعثت سے قبل کا زمانہ ہے جس میں نجوم نبوت لاکھوں کی تعداد میں چمکتے رہے اور وہ آدم علیہ السلام سے لیکر زمانۂ ولادت نبوی تک کا زمانہ ہے جو تقریباً سات ہزار برس ہوتا ہے۔ گویا سات ہزار برس کی ایک روحانی لمبی رات عالم پر گذری جس کے بعد دن نکلا اور وہ دن ۶۳ سال کا دن تھا۔ اس دن کے اگر سات حصے کئے جائیں تو نو نو برس کے سات حصے ہوتے ہیں جس کے یہ معنی ہونگے کہ خاتم نبوت کے ۹ برس پچھلی نبوتوں کے ایک ہزار برس کی برابر ہوتے ہیں۔ ان نبوتوں نے ایک ایک ہزار برس کے دوروں میں جو کام انجام دیئے وہ خاتم النبیین نے ۹ برس میں انجام دیدیئے ولادت شریف سے بعثت تک چالیس سالہ مدت گو نبوت کی مدت نہیں کہلاتی مگر مبادیٔ نبوت اور نبی کی پاک فطرت کے ظہور کی مدت ضرور ہے جسے متعلقات نبوت ہی میں سے سمجھنا چاہئے۔

بہرحال صبح صادق کے بعد طلوع آفتاب کا سب سے بڑا فیض روز روشن کا وجود ہے جو صرف آفتاب کی ساتھ مخصوص ہے اور اس میں کوئی ستارہ بلکہ سارے

ستارے مل کر بھی اس کے سہیم و شریک نہیں ظاہر ہے کہ اس صورت میں جو دن کی
خصوصیات ہیں وہ بھی آفتاب ہی کی ساتھ مخصوص ہوسکتی ہیں نہ کہ ستاروں کے
ساتھ۔ ستاروں کے ساتھ اگر ہوں گی تو رات کی خصوصیات ہوسکتی ہیں نہ کہ دن کی
سو رات کی خصوصیات یہ ہیں کہ لوگ جسمانی حیثیت سے آرام کرتے ہیں عام کاروبار
اور اجتماعی امور جیسے تمدنی معاملات لین دین میل جول عمومی معاشرت۔ نظام
ملت دفتری اور سیاسی مہمات۔ قومی معاہدات بین الاقوامی معاملات جنگ
وجہاد ملکی فتوحات ملتوی رہتی ہیں۔ معاملات کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ
اہل وعیال کے واجبی حقوق، عزیز واقارب یا اور آگے بڑھ کر پڑوسیوں کے
حقوق کچھ ادا کئے جاتے ہیں اور اسے ہی بہت کچھ سمجھا جاتا ہے۔ ہاں روحانی لوگ
روحانی طور پر اگر خدا پرستی میں لگتے ہیں تو انفرادی طور پر خلوۃ گزینی کے ساتھ فرائض
عبودیت ادا کرتے ہیں ورنہ اجتماعی عبادتوں کا محل عادۃً اور عامۃً رات نہیں ہوتی
اسی لئے قرآن حکیم نے دن کو معاش فرمایا اور رات کو سکنا بتایا۔ دن کاروباری
اور میل عمل کی زندگی کا وقت ہے اور رات سکون اور یکسوئی کا وقت ہے۔ بالفاظ دیگر دن
اجتماعیت کا زمانہ ہے اور رات انفرادیت اور انقطاعیت کا۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع سے قبل جبکہ لیلی روحانی رات تھی
مذاہب عالم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں انفرادیت بلکہ انقطاعیت
کا رنگ غالب تھا۔ تنہا تنہا عبادت کرنا اصل تھا دین میں کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی
کوئی اجتماعی رنگ نہ تھا۔ مخلوق سے الگ تھلگ رہ کر ہی خالق کی یاد ممکن سمجھی
گئی تھی۔ گوشہ گیری رہبانیت خلوت گزینی عبادت کی اصل لوگ پہاڑوں کی

چوٹیوں، لق ودق بیابانوں اور دریاؤں کے کناروں پر پہنچکر ریاضتوں میں مشغول رہنا ہی روحانیت جانتے تھے۔ انھیں بسلسلۂ تکمیل روحانیت دنیا کے شہری اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ مذہب کے معنی ہی صرف بندہ اور خدا کے درمیانی رابطہ کے تھے۔ ملک الگ اور دین الگ تھا۔ ہر ایک دائرہ کے رجال کار الگ الگ تھے جو گویا قومی تجزیہ کے طور پر مخصوص ہو جاتے تھے۔ مخلوق رسی اور میل جول کے رشتے منافئ روحانیت سمجھے جاتے تھے۔ کسی مذہب میں نکاح اور عورت سے انتفاع خلاف روحانیت تھا تو روحانی ترقی کی پہلی سیڑھی ترک نکاح تھا۔ کسی مذہب میں شہری زندگی منافئ روحانیت تھی اس لئے گھر بار زمین جائداد اور تعلقات سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھنا ہی سب سے بڑی عبادت تھی۔ کسی مذہب میں کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی نعمتوں سے مستفید ہونا خلاف روحانیت تھا۔ اس لئے لذائذ ترک کر کے جنگل کے پتوں اور بناسپتی پر گذر بسر کرنا، لباس کے بجائے لنگوٹی کی ایک دھجی باندھ لینا، یا کھانے کمانے میں بھیک پر گذر کر لینا ہی سب سے بڑا زہد و تقویٰ اور تواضع و انکساری کی روح سمجھا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر تعذیب روحانی کے بجائے تعذیب جسمانی مذہب تھی۔ اس لئے خودکشی کر لینا اپنے کو پہاڑوں سے گرا کر ہلاک کر لینا دریاؤں میں ڈوب کر مر جانا آگ چاروں طرف جلا کر بیچ میں اپنے کو تپانا۔ اور کباب بنانا۔ کانٹوں اور کیلوں پر بیٹھ کر بدن کو چھید ڈالنا ہی دینی ریاضت سمجھی جاتی تھی جس کا حاصل تعذیب جسمانی کے ساتھ وہی مخلوق سے انقطاع اور اپنے کو سارے بشری تقاضوں سے خالی کر لینا نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ دور روحانی رات کا

تھا اور رات میں انفرادیت ہی کا دور دورہ ہوتا ہے نہ کہ اجتماعیت کا یکسوئی ہی کا غلبہ ہوتا ہے نہ کہ ذات البینی معاملات کا۔ باقی اس سے انبیاء وقت یا شرائع الٰہیہ پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ یہ سب کچھ تنگیاں اور دینی احکام میں انقطاعیت اور انفرادیت اس وقت کی جبلتوں کا تقاضا تھا۔ نفسانی قوتیں جتنی قوی ہوتی ہیں اتنا ہی شدید میلان دنیا اور لذائذ دنیا کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس سے اٹھانے کے لئے اتنا ہی سخت مجاہدہ اور ریاضت ان سے کرایا جاتا ہے کہ اس کے بغیر ایسے قوی نفوس روحانیت کی طرف نہیں آسکتے۔ امم سابقہ اپنی نفسانی قوتوں کے لحاظ سے اس قدر شدید اور ان کی جبلتیں اور طبیعتیں اس درجہ دنیا کے جاہ و مال کی الفت میں غرق تھیں کہ اگر کسی حد تک بھی انھیں دنیوی شوکت و دولت اور لذات دنیا میں ڈھیل دی جاتی تو ان کے منحرف نفوس دین کو یکسر خیرباد کہکر دنیائے محض ہی پر آگر رُکتے اور کبھی بھی انھیں دین حق سے لگاؤ نہ ہوتا بس ان کا دین کسی طرح بھی بغیر اس کلی یکسوئی اور انقطاع لذات کے تھم نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت کا دین دنیا کے تمدن کے دوش بدوش نہیں چل سکتا تھا اور اس وقت کی دنیا کا کوئی ایک طبقہ بھی دین اور دنیا دونوں کا جامع نہیں ہو سکتا تھا دین کا حامل وہی طبقہ ہوتا تھا جو دنیا سے کلی انقطاع کر کے رہبانیت کے ساتھ گوشہ گیری اختیار کرے۔ اس لئے دین کو دنیوی شوکت سے الگ کر کے ملوکیت ایک طبقہ کو دیدی جاتی تھی اور روحانیت کا حامل دوسرا طبقہ بنتا تھا۔ جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ گرجاؤں زاویوں صومعوں اور مندروں

میں محبوس رہتا تھا اُسے ان زاویوں سے باہر نکلتے ہی خطرہ تھا کہ شیاطین اس کا دین اچک لیں گے اور وہ ان کے تمدن اور سامانوں کے قریب پہنچکر اپنے دین کو کسی طرح بھی نہ سنبھال سکیگا۔ پس نفوس کی کمزور روحانیت اور قوی ترین نفسانیت اس انفرادیت اور انقطاعیت کا سبب ہوتی تھی نہ کہ معاذ اللہ انبیاء کی قوت روحانی کی کمی یا دین کا نقص۔ اس لئے جتنا بھی ان کی طبیعتیں طبعاً دین برداشت کر سکتی تھیں اتنا ہی دین ان کے لئے اتارا جاتا تھا جس میں جامعیت نہ ہوتی تھی کہ طبائع ہی جامع نہ تھیں جو جامع دین کا تحمل کر سکتیں۔

لیکن جوں ہی آفتاب نبوت نے طلوع کیا اور روحانیت کا دن نکل آیا۔ تو قدرتی طور پر انفرادیتیں ختم ہو کر اجتماعیتوں میں تبدیل ہونے لگیں کیونکہ دین طبعاً یکسوئی کا وقت ہوتا ہی نہیں بلکہ جلوتوں اور اجتماعی کاموں کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے جب آفتاب نبوت کا نور چمکا تو طبیعتیں جامع دین اور اجتماعی روحانیت کی طرف مائل ہونے لگیں اور اپنی خاموش پکار سے ایک ایسا دین مانگنے لگیں جس میں دین کے ساتھ دنیا سے انقطاع نہ ہو دیانت کے ساتھ سیاست اور نظم ملت بھی جمع شدہ ہو اور انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت بھی مخلوط ہو کیونکہ دنیا کی آخری امت ظاہر ہو چکی تھی جو پچھلی اقوام و امم کے تجربات علمی طور پر سامنے رکھتی تھی ابتدائی قوتوں کی افراط کے رد عمل کا قدرتی تقاضا تھا کہ آخری قوم مزاج میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال رکھتی ہو، نہ اس کے نفسانی قویٰ ایسے ہیجان میں آئے ہوئے ہوں کہ وہ

دنیوی لذات کے ساتھ دین اور روحانیت کے تصور ہی سے بھاگنے لگے اور نہ ایسی متقشف اور زاہد تنگ نظر ہو کہ دنیا اور اس کی لذات کے مادے ہی اس میں سے ختم ہو چکے ہوں بلکہ اس میں قوائے نفسانی اور قوائے روحانی کا ایک ایسا معتدل امتزاج تھا کہ وہ دین کے ساتھ دنیوی شوکت کو اور دنیوی شوکت کے ساتھ روحانیت کو جمع کرنے کی اہل ہو چکی تھی وہ تخت سلطنت پر بیٹھکر درویش بھی رہ سکتی تھی جیسے خلفاء راشدین اور صلحاء سلاطین نے کی اور وہ درویشی کی گلیم اوڑھ کر ملت کی تنظیم بھی کر سکتی تھی جیسا کہ انھوں نے کر کے دکھلائی اس لئے ملک و دین توام کر دئے گئے اور ایک ایسی جامع اور کامل نبوت بھیجی گئی جو جلال و جمال، مہر و قہر دیانت و سیاست کی بیک آن حامل تھی اور اس کامل امتزاج دین و دنیا کے سبب انھیں استخلاف فی الارض کا منصب عطا کیا گیا نہ انھیں کورا ملک بلا دین کا دیا گیا اور نہ کورا دین بلا شوکت کے دیا گیا چنانچہ دین بے شوکت کے بارہ میں اعلان ہوا کہ

لا رھبانیۃ فی الاسلام — اسلام میں گوشہ گیری اور انقطاعیت نہیں۔

لذات لباس و طعام کے بارہ میں بتلایا گیا کہ وہ دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ — آپ ضرور کہئے کہ اللہ کی زینت اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا جسے اللہ نے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے۔

بتلایا گیا کہ گھر گھرستی ہونا دین و روحانیت کے منافی نہیں بلکہ معین دین ہے۔

النکاح سنتی فمن رغب عن — نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے

مستنی فلیس منی۔　　　اعراض کیا وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔

گھر بار رکھنا اور زمین جائداد کا حاصل کر لینا دین کی ضد نہیں ہے جو اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا۔　　　اور اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے وجہ سکون بنایا ہے۔

اور آخر کار صاف اعلان کر دیا گیا کہ آج کے دن دین اور ملک جمع کر دئے گئے جیسے دو جوڑاں بچے پیدائشی طور پر جڑے ہوئے پیدا ہوتے ہیں کہ انھیں کوئی جدا نہیں کر سکتا اور کر دیا جائے تو دونوں ضائع ہو جائیں۔

الملک والدین توامان　　　ملک اور دین جوڑواں بچے ہیں اللہ تعالیٰ
اللہ امرنی بھن الجماعۃ　　　نے مجھے ان چیزوں کا حکم فرمایا ہے جماعت
والسمع والطاعۃ والھجرۃ و　　　سمع وطاعت ہجرت اور جہاد کا۔
الجہاد (تفسیر ابن کثیر)

الامام جُنّۃ ومن لم یعرف　　　امام ڈھال ہے جس نے امام وقت
امام زمانہ فقد مات میتۃ　　　کو نہیں پہچانا اس نے موت جاہلیت
جاھلیۃ الجہاد ماض الی　　　کی پائی۔ جہاد قیامت تک جاری رہنے
یوم القیمۃ۔　　　والا ہے۔

پھر عبادات بھی جماعتی رکھی گئیں۔ نماز با جماعت ہوئی جس کے لئے امام ضروری ہے حج با جماعت ہوا جس کے لئے امام ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا نظم جماعتی ہوا جس کے لئے امام یا اس کے قائم مقام کا وجود ضروری ہے۔ سفر جماعتی ہوا جس کیلئے

امیر کا انتخاب ضرور ہوا۔ تدبیر منزل جماعتی ہوئی جس کے لئے امیرِ خانہ کی ضرورت ہوئی
کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ — تم میں کا ہر ایک نگہبان ہے اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں اس سے سوال کیا جائیگا۔

دنیاداری اور دینداری کی تفریق اوٹھ گئی اور بتلا دیا گیا کہ ہر دنیا دار اپنی پوری دنیا سمیت دیندار ہو سکتا ہے اور ہر طبیعی اپنے تمام امورِ طبیعہ کو نیت و اتباع کے رشتہ سے باندھ کر شرعی بن سکتا ہے یعنی امورِ طبیعیہ کو امورِ شرعیہ بنا دیا گیا ہے۔ کھانا کھانے، بیوی کے پاس جانے، پڑکر سوتے اور قضائے حاجت کے لئے کو موجب اجر بتایا گیا جبکہ وہ طریق سنت پر ہو۔ عیادت، مریض، بیمار پرسی۔ مشایعت جنازہ، میت کو غسل دینا، تعزیت اموات، تجہیز و تکفین کی شرکت عبادت قرار پائی، بیوی کی خدمت، عیال کی تربیت، غلاموں کی خبر گیری، یتیموں پر شفقت، مظلوموں کی حمایت، سرکشوں کو دبانا۔ قاتلوں سے قصاص چوروں کو سزا، شراب خواروں کی تعزیر، جوئے بازوں کی پاداش، مفسدوں سے جنگ، عبادت و دین قرار پائی۔ تجارت، صنعت حرفت، ملازمت دیانت کا جزو بن گئی۔ بین الاقوامیت، بین الاوطانیت، عالمی قومیت، عالمی تنظیم یعنی خلافت اُرُس دین بن گئے۔ امارت، شورائیت، عسکریت، اصول دین ہوئے بھیک مانگ کر انفرادیت کو قائم رکھنے کی کوشش مذموم قرار پائی۔ یدِ علیا یدِ سفلیٰ سے بہتر قرار دیا گیا۔ ہر وہ چیز عبادت اور قربت و طاعت بتائی گئی جس میں ایک کو دوسرے سے سہارا لگے۔ قول سے ہو یا عمل سے اخلاق سے ہو یا اشارہ سے اور اعلان کر دیا گیا کہ

واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ۔ — اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جبتک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

البتہ ان سب چیزوں کی شرعی حدود قائم کی گئیں اور بتا دیا گیا کہ اسلام فطری قوتوں کو پامال کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے وہ ہر قوت سے کام لیگا۔ شہوت ہو کہ غضب بہیمیت ہو یا ملکیت سب ملکر ہی انسانیت بنتی ہے۔ اس لئے ان کا بقاء انسانیت کا بقاء ہے جبکہ وہ بتلائی ہوئی حدود اور مقرر کردہ نظام کے اندر اندر رہے۔ بس اس ملی و اجتماعی نظام کے سبب اس دین کی شکل بادشاہت کی سی ہو گئی۔ اور تمام لوازم حکومت اس کے اندر شامل ہو گئے۔ جس کی وجہ اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ یہ نور آفتاب نبوت کا نور تھا اور جیسے آفتاب آخری سیارہ ہے جس کے بعد کسی ستارے کی نورانیت نہیں چلتی اس لئے اسکا نور او دین بھی آخری دین تھا جسے قیامت تک باقی رہنا تھا اور دوامی بقاء انفرادیت کے ساتھ نہیں ہو سکتی کیونکہ افراد سب گذشتنی اور رفتنی ہوتے ہیں اگر یہ دین انفرادی ہوتا تو افراد کے گذرنے سے ختم ہو جاتا جیسا کہ پچھلے ادیان انفرادی تھے جو افراد کے گذرنے سے گذر گئے اور ہر پچھلے دین کے گذر جانے پر نیا دین آیا اس لئے ان میں سے کسی دین کو بھی بقاء دوام حاصل نہ ہوئی لیکن یہ دین جبکہ آخری دین تھا تو اسے اجتماعی رکھا گیا جو افراد سے نہیں اصول اور جماعت سے برپا ہوا سنت اور جماعت اس میں اصل ہوئے نہ کہ محض افراد اس لئے افراد گذر گئے مگر جماعتی نظام اور اصول قائم رہے جو افراد کے ختم ہونے سے

ختم نہیں ہو سکتے اس لئے دین باقی رہا اور تا قیام قیامت باقی رہے گا۔ بہر حال اس سے واضح ہے کہ جیسے مادی رات کی خصوصیت انفرادیت اور انقطاعیت ہوتی ہے اور دن کی اجتماعیت اور کاروباری میل جول۔ ایسے ہی روحانی رات کی خصوصیات بھی دینی انفرادیتیں اور رہبانیتیں تھیں۔ اور جب آفتاب نبوت کے طلوع ہونے پر دن نکل آیا تو وہ انقطاعیتیں خود بخود ختم ہو کر اجتماعی زندگی کا دور دورہ اچانک سامنے آگیا جو دن کی روشنی ہی میں سامنے آسکتا تھا جس میں دین و ملک نے بیک وقت جمع ہو کر جماعتی تنظیم اور اجتماعی نظام کی صورتیں نمایاں کر دی۔ اور اس لئے اسلام کا نظام اجتماعی دنیا کے لئے انقلاب آفرین ثابت ہوا جس نے ذہنیتوں میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا۔

جامع انقلاب چنانچہ آفتاب سے جہاں روشنی و گرمی کے فیوض عالم کو پہنچتے ہیں اور ایک ہیج پر ہزاروں ہزار سال سے یکساں پہونچتے آ رہے ہیں جنمیں کوئی تغیر نہیں آتا وہیں آفتاب میں تغیر آفرینی اور انقلاب انگیزی کی شان بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ اشیاء کی ماہیتیں اور حقیقتیں تک بدل ڈالتا ہے گویا سارے سیاروں میں وہ ایک انقلابی سیارہ ہے جو ماہیتوں کو تبدیل کر دیتا ہے اور دنیا پر اس کے اثرات انقلابی رنگ میں پڑتے ہیں کہ مثلاً ستارے اگر جڑی بوٹیوں میں رس اور نلی میں گودا پیدا کرتے ہیں تو یہ ایک نمیت اتر کر جو خالی ظرف میں بھر جاتا ہے کوئی چیز بدلتی نہیں لیکن سورج انھیں پگھلا کر یا خشک کر کے معدوم بھی کر دیتا ہے جس سے شے ہی نہیں رہتی۔ چاند بلاشبہ سمندروں کو تہ و بالا ضرور کر دیتا ہے مگر اس سے سمندر کی صرف ہیئۃ بدل

جاتی ہے ماہیت نہیں بدلتی لیکن سورج اس کی کیفیات اور خواص تک کو بدل ڈالتا ہے اس کڑوے سمندر کو گرما گرما مانسون بنا دیتا ہے جس سے کڑوا پانی میٹھا ہو جاتا ہے سمندر سفلی ہے مگر آفتاب اسے گرما کر اور اس سے مانسون اٹھا کر اس کے ایک حصہ کو علوی کر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جائے۔ اور عالم میں خیر بن پانی بن کر برس پڑے، سمندر سیال ہے مگر سورج اسے مانسون بنا کر بادلوں کی شکل دیدیتا ہے جو منجمد ہوتے ہیں۔ یہی سورج زمانہ پر اثر ڈالتا ہے تو اپنی چال سے رات کو دن کر دیتا ہے اور دن کو رات، یہی سورج ہواؤں پر اثر ڈالتا ہے تو نسیم کو صرصر اور ہوائے سرد کو ہوائے گرم بنا دیتا ہے غرض تر کو خشک کو تر خام کو پختہ اور پختہ کو خام، بہاؤ کو ٹھیراؤ اور ٹھیراؤ کو بہاؤ سکون کو حرکت اور حرکت کو سکون۔ مُردنی کو زندگی اور زندگی کو مردنی سے بدل دینا اور شے کے اندرون کو منقلب کر دینا بلاشبہ انقلاب ماہیت ہے جو سورج ہی کا کام ہے جس میں کوئی ستارہ اس کا ہم پلہ نہیں۔

ٹھیک اسی طرح نجوم ہدایت انبیاء علیہم السلام نے اقوام عالم کی اصلاح فرمائی اور ان کے پاکیزہ اثرات سے دنیا نے اللہ کا راستہ دیکھا۔ لیکن صرف اس انداز سے کہ ان کی جبلتیں اپنی جگہ باقی رہیں انھیں کچھ مغلوب یا مستور کر کے دین کی رسوم انھیں اٹھا دی گئیں یعنی شاق شاق ریاضتوں، ترک دنیا، ترک لذائذ اور ترک آسائش وراحت سے اس جبلت کو دبائے رکھا تو وہ کسی حد تک دین پر لگے رہے اگر وہ اس دین پر رہتے ہوئے ذرا بھی اپنی رہبانیت کو ترک کر دیتے تو اسی وقت ان سے دینی جذبات رخصت ہو جاتے

بالکل اس طرح جیسے دشمن کو کسی مکان میں بند کر کے اس سے بچاؤ اختیار کر لیا جائے
اور نفس سے اس فرصت میں کچھ روحانی کام لے لیا جائے۔ لیکن اس کا ردِ عمل
قدرتی طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ اگر ذرا بھی قید خانہ کا قفل کھل جائے تو وہ بھی
جبلّت نفسانی اور طبعی مزاج ادھر کر روحانی مزاج کو پھر درہم برہم کر ڈالے
لیکن آفتاب نبوت نے تکمیل انسانیت کے لئے نفسانیت کو بند یا محبوس کرنے
کے بجائے اور سے بدستور قوی رکھا اور بند بھی نہیں کیا مگر اسے اپنا لیا اور اس سے
روحانیت کی خدمت لی۔ اور ان طبعی تقاضوں کو پامال کرنے کے بجائے
انھیں شرعی بنا دیا اور ٹھکانے لگا دیا کہ وہ خود روحانیت کے خادم بن گئے
اب وہی شہوت بجائے اس کے کہ خصّی ہو کر اسے پامال کیا جاتا عقل و شرع
کے سامنے اسے جھکا دیا جائے اور اس کے تمام طبعی افعال کو صحت نیت اور
صواب طریق سے شرعی بنا دیا گیا یعنی وسیلۂ دین بنا کر انھیں طبعی سے شرعی کر دیا
اس لئے ایک مومن کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، دوستی و دشمنی،
معیشت و معاشرت، مباشرت و مجامعت جبکہ بقصد دین اور بطرز سنت
نبوی ہو دین ہو جاتا ہے اور معاشرت کے یہ تمام گوشے دین کے شعبے بنجاتے
ہیں گویا اس تشریعی انقلاب سے عادت عبادت اور دنیا دین بن جاتی ہے
پس آفتاب نبوت کی پیش کردہ روشنی اور عملی پروگرام نے ان سب طبعی تقاضوں
کی ماہیتوں کو بدل کر انھیں شرعی و داعی بنا دیا اور ایک عظیم دینی انقلاب بپا
کر دیا۔ اس لئے ایک مومن کو آج شہوت غضب، حرص و ہوس، بخل و طمع
حقد و حسد، محبت عداوت وغیرہا کو مٹانے یا بند کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ

بطرز مذکور ٹھکانے لگا دینے اور اپنا لینے کی ضرورت ہے۔ تو وہی قوائے طبعیہ جو فساد کی طرف لیجاتے تھے صلاح و رشد کی راہ چل پڑیں گے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آج کے دور میں رہبانیت بدن سے ہٹ کر قلب میں آگئی یعنی نیت و خیال اور قوت فکریہ کو اسلام نے رہبان بنا دیا کہ وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے صرف اللہ کی طرف جھک جائے اور جب ان قویٰ ہی کا رُخ اللہ کی طرف ہو گا تو ان سے صادر شدہ افعال بھی قدرتی طور پر اللہ ہی کے لئے ہو جائیں گے خواہ بظاہر دنیوی نظر آئیں۔ پس اور مسلکوں کی رو سے انسان معطل ہو تو خدا تک پہنچے اور اسلام کی رو سے انسان رہ کر خدا تک پہنچیگا یہی وجہ ہے کہ ایک فعل ایک جہت سے حرام ہوتا ہے اور اسی پروگرام کے تحت دوسری جہت میں حلال بلکہ عین طاعت و عبادت بن جاتا ہے۔ اکڑ کر چلنا حرام تھا جبکہ مقصد رضا نفس تھا لا تمش فی الارض مرحًا (زمین میں اکڑ کر مست چلو) لیکن وہی فعل طواف بیت اللہ میں حلال بن کر عبادت ہو گیا جبکہ مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور رضاء حق ہو گیا۔ وہی حرص حرام تھی جبکہ مفاد دنیوی کے لئے تھی اور وہی حرص حلال ہو کر موجب ثواب بن گئی جبکہ مفاد آخرت کے لئے استعمال میں آنے لگی۔ وہی لوٹ مار حرام ہے جبکہ نفس کی خاطر اور بمقابلۂ مقبولان الٰہی ہو اور وہی لوٹ مار حلال ہے جبکہ جہاد میں دشمنان خدا کے مقابلہ میں ہو۔ وہی جھوٹ حرام ہے جبکہ فتنہ انگیزی کے لئے ہو اور وہی جھوٹ حلال بلکہ باعث اجر ہے جبکہ دفع فتنہ اور اصلاح ذات البین کے لئے ہو۔ پس آفتاب نبوت نے ترفع، حرص، غارت گری، لوٹ مار وغیرہا جیسے طبعی جذبات

کو بھی دل کے کسی کونہ میں بند رکھ کر تالا نہیں لگایا کیونکہ تالا کھلنے پر اندیشہ تھا کہ وہ باہر نکلتے اور مزید قوت کے ساتھ نفس کو از سر نو فاسد کر ڈالتے بلکہ ان کے رُخ کو بدل کر بجائے نفس کی خدمت گذاری کے رب العزت کی خدمت گذاری پر لگا دیا تاکہ وہ بندش اور آزادی ہیں ہمہ وقت عظمت حق کی راہ پر چلتے رہیں اور اپنی اپنی جگہ قائم رہ کر انسانیت کی صحیح خدمت انجام دیں پس نبوت کے اوستادوں نے ذہنوں میں جذبات اور انسان کے نفس کو قید و بند سے جکڑ کر نفس کو ان سے الگ کیا تاکہ نفس ان کے پھندے میں نہ پھنس سکے اگر ان کے متعلقہ کاموں سے معطل بھی ہو جائے ۔ اور آفتاب نبوت نے ان قویٰ کو آزادی دے کر خود ان سے کام لیا اور اس طرح ان سے متعلقہ تمام کاموں کو عبادت بنا دیا جس سے ذہنوں اور ذہنی قویٰ میں انقلاب عظیم بپا کر دیا۔ تر کو خشک، اور سفلی کو علوی بنا دیا طبیعت کو جو سفلی تھی اسے علوی روحانیت میں تبدیل کر دیا۔ دنیا کو جو ناپاک تھی پاک دین بنا دیا۔ ناسوتی زندگی کو جو خسارہ ہی خسارہ تھی ملکوتی اور لاہوتی زندگی بنا دیا جو کمال محض ہے۔ غرض بشر کو بشر رکھ کر ملکوتی صفات و افعال سے آراستہ کیا بشر کو بشریت سے نکال کر ملک نہیں بنایا کہ وہ بشریت کی ترقی نہوتی بلکہ بشریت کا انعدام ہوتا جو کمال نہیں صرف ایک جزوی خوبی یا ایک نوع کی فنی مہارت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کنارہ کشی، گوشہ گیری اور خلوتی بن جانے کا نام نہیں بلکہ جلوتوں کے ہجوم میں رہ کر ہر قوت کو بتلائے ہوئے مصرف میں صرف کرنے اور اس کے واجبی حقوق ادا کرنے کا نام ہے۔ اور یہی وہ آفتاب نبوت کا

انقلابی کارنامہ ہے جو سابقین سے انجام نہیں پایا اور اسی کا نام اکمال دین ہے جس کے لئے ختم نبوت کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پس سابق نجوم ہدایت نے ان طبعی جذبات کو پامال کر کے یا انھیں محبوس کر کے شرعی راہوں پر لگایا اور آفتاب نبوت انھیں باقی رکھ کر انہی سے انسانی دین کی ترقی کرائی اور عین دنیا کو دین بنا دیا اس لئے آج حسّی ترک دنیا کی ضرورت نہ رہی بلکہ دنیا خادم دین کی حیثیت سے باقی رکھ کر اسی کو ترقیات دینی کا راستہ بنا دینے کی ضرورت ہے۔ قدیم مذاہب شہری زندگی چھڑا کر خدا رسی تک لاتے تھے اور اسلام شہر بسا کر خدا تک پہنچاتا ہے۔ اور نجوم ہدایت نے وسائل تمدن، وسائل معاش۔ ازدواج واولاد اور گھر بار اور تمام وجوہ معاشرت چھڑا کر یا جنگلوں چڑھا کر جمال خداوندی دکھلایا اور آفتاب نبوت۔ اس تمدن۔ شہری آبادکاری اور تزوج وتوالد ہی کو آئینۂ جمال حق بنا دیا جس کو سامنے رکھ کر ہی حق نظر آسکے۔

اسی طرح اور نجوم ہدایت کی روشنی ہر لڑائی بھڑائی ملک گیری اور چڑھائی سے الگ تھلگ کر کے خدا کا چہرہ دکھلاتی ہے۔ اور آفتاب نبوت اعلاء کلمۃ اللہ کی جنگ ہی کو افضل ترین عبادت بنا کر اس کے ذریعہ مشاہدۂ حق کراتا ہے۔ غرض وہاں ترک دنیا حسّی ہے اور یہاں ترک دنیا عقلی اور معنوی ہے۔ وہاں نفس امارہ کی ہتیں برسر کار نہیں آسکتیں جبکہ دشمن کے سامنے سے ہٹ جانے کا اصول سامنے رکھا گیا ہے۔ اور یہاں نفس کی اندرونی ہمت وقوت اپنا پورا کام کرتی ہے جبکہ دشمن کے سامنے ڈٹ جانے اور اسے رام کر لینے کی پالیسی سامنے رکھدی گئی ہے۔ غرض آفتاب نبوت نے رہبانیت کو عوامیت سے خلوت، کو جلوت سے

اور انقطاعیت کو اجتماعیت سے تبدیل کر کے پوری دنیا کا دھارا بدل دیا ہے۔ پس آج کی دنیا میں جبکہ ساری دنیا کی قومیں ایک پلیٹ فارم پر آگئی ہیں۔ اور اجتماعیت و اشتراکیت کے جذبات برسر کار آچکے ہیں آیا وہ ترک لذات گوشہ گیری اور رہبانیت کا اصول جذبات کو اپیل کر سکتا ہے یا مادیات کو ساتھ لے کر دینی راہیں قطع کرنیکا اصول دلوں میں جاگزیں ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ دلوں کی آواز دوسری ہی ہو سکتی ہے اس لئے کہ اجتماعیت کبریٰ کا اصول ہی وہ فطری راہ ہوگا جس سے کوئی فرد بشر انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسی جامعیت اسلام کی طرف انبیائے سابقین نے بھی واضح اشارے فرمائے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد فیض بنیاد اس بارہ میں صاف ہے۔

کیا قوئ انسانی کو پامال کر دیا جانا امر معقول ہوگا کہ نہ انسان میں شہوت باقی رہے نہ غضب نہ حرص رہے نہ جذبات و حسیات بالفاظ دیگر نہ انسان رہے نہ اس کی انسانیت۔ دنیا میں فعل و عمل کی گرم بازاری ہے۔ اگر قویٰ ہی نہ رہیں تو عمل کیسے سرزد ہو اور عمل نہ رہے تو قوائے انفس و آفاق کے خواص و آثار کیسے نمایاں ہوں؟ یا پھر ان قویٰ کو قائم رکھ کر انھیں اعتدال کے ساتھ ان کے صحیح مصرف میں صرف کیا جانا اور انسان کو مع اس کی انسانیت کے باقی رکھنا امر معقول ہوگا۔ جس سے دنیا میں تخلیق الٰہی کے نئے نئے عجائبات نمایاں ہوں اور دنیا کی انفسی اور آفاقی مکنون طاقتیں کھل کھل کر سامنے آتی رہیں جس سے انسان کی خلافت کبریٰ کا ظہور ہو۔ ظاہر ہے کہ عقلمند دنیا اس دوسری ہی صورت کو پسند کر سکتی ہے کیونکہ قویٰ بشری کے پامال ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں

بشر ہی باقی نہ رہے۔ اور جب نوع بشری ہی باقی نہ رہیگی تو یہ مذہب آخر خطاب کسے کرے گا لیکن اگر انسان کا بقار ضروری ہے تاکہ مذہب کا خطاب صحیح ہو اور انسان کی بقار کے معنی اس کی طبعی اور خلقی قوتوں کا بقار ہے تو انسان کی انسانیت کے معنی یہی ہوں گے کہ اس کی قوتوں کا کسی صحیح ڈھنگ سے ظہور ہو تاکہ کامل انسانیت کا نقشہ کامل روحانیت پر ٹھیک مطابق آجائے۔

اوران قوتوں کو ٹھکانے لگاکر ایک کامل الخلقت انسان کو اس کی کامل مادی قوتوں کے ہجوم میں کامل الروح انسان بنا دیا جائے۔ اس لئے یقیناً آج کی دنیا اسی آخری اصول کی تصدیق کرے گی گو پہلے اصول کو جھٹلائے بھی نہیں جبکہ وہ بطور معالجہ اپنے وقت پر کسی دور میں یہی کارآمد بھی رہا ہے لیکن پھر بھی اس اصول کو محدود سمجھنے پر بھی مجبور ہوگی جس کے لئے بقار دوام نہیں ہوسکتی۔

اس انقلاب کا ثبوت توراۃ وانجیل سے تورات کی کتاب استثنار کے باب ۳۳ میں ہے

کہ "خدا سینا سے آیا۔ ساعیر سے طلوع ہوا اور فاران سے چمکا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی"

ظاہر ہے کہ خدا کے سینا سے آنے کے معنی نبوت موسوی اور شریعت توراۃ کا ظہور ہے۔ ساعیر سے طلوع ہونے کے معنی نبوت عیسوی اور شریعت انجیل کا ظہور ہے اور فاران سے چمکنے کے معنی نبوت محمدی اور شریعت قرآن کا ظہور ہے جس کے جلوے بالآخر سارے عالم پر پڑے۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونا فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت خاتم الانبیار صلے اللہ علیہ وسلم

کی ساتھ دس ہزار مقدس صحابہ کا لشکر تھا چنانچہ سیرت ابن ہشام، تاریخ طبری البدایہ والنہایہ، تاریخ کامل ابن اثیر، زاد المعاد، تاریخ ابن خلدون وغیرہ کا فاتحین مکہ کے اس عدد پر اتفاق ہے آتشیں شریعت کے معنی دین کے ساتھ سیاسی قوۃ اور اجتماعیت کے جمع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اس شریعت میں حدود و قصاص، تعزیرات و کفارات، جہاد و قتال اور خلافت و امارت جزو دین کی حیثیت سے آئی اور الملک والدین توامان (ملک اور یہ دین دو جڑواں بچے ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا) کا ظہور ہوا۔

یہ جامعیت یقیناً ان ادیان میں نہ تھی جو سینا اور ساعیر سے چمکے تھے چنانچہ دین مسیح کے بارے میں تو خود مسیحؑ ہی نے اعلان فرمادیا تھا کہ

میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ اگر میری بادشاہت ہوتی تو میرے خادم لڑتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاتا۔

(انجیل یوحنا باب ۱۸/۳۶)

جس سے دین کے بارہ میں جہاد و ملک کی صاف نفی ہے۔

اسی طرح حدود و تعزیرات کے بارہ میں حضرت مسیح نے صاف اعلان فرمایا کہ

تم سن چکے ہو کہ کیا کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور دانت کے بدلہ میں دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔

(انجیل متی باب ۵/۳۸)

جس سے حدود و تعزیرات کی صاف نفی واضح ہے۔

اسی طرح معاملات اور ثالیثوں اور عدالتی امور کے بارہ میں ارشاد مسیحی ہے

"پھر بھیڑ میں سے ایک نے اس سے کہا اے استاد میرے بھائی سے کہہ کہ میراث کا حصہ مجھے دے۔۔۔۔ اُس نے (مسیح نے) اس سے کہا میاں کس نے مجھے تمہارا منصف یا بانٹنے والا مقرر کیا۔

(انجیل لُوقا باب ۱۲)

جس سے ثالثی عدالتی فیصلہ اور حکم ہونے کے منصبوں کی نفی صاف مذکور ہے

ادہر شریعت موسوی میں سیاست تو تھی مگر دین کے ساتھ مخلوط ہو کر نہیں بلکہ اسے دینوی شعبہ قرار دے کر ملوکیت کا دائرہ نبوت کے دائرہ سے الگ رکھا گیا تھا انبیاء کا کام ہدایت دینا اور ملوک کا کام اسے جاری اور نافذ کرنا تھا خود سیاست میں دیانت یا دیانت میں سیاست کھپی ہوئی نہ تھی کہ دونوں کا ملکر ایک رنگ ہوتا اور مجموعہ کو دین پکارا جاتا۔ اسی کو انجیل نے باقی رکھا کہ پوپ کا حصہ پوپ کو دو اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو۔ اسی لئے یہ شرائع فقط اسرائیلی مزاج کے مطابق تھیں جنھیں ایک ہی رہبانیت پسند طبقہ قبول کر سکتا تھا ترقی پسند قومیں تنظیم ملت اور عالمیت مزاج اقوام کے دردر کا ان میں کوئی سامان نہ تھا۔

اس انقلاب عمومی کا ثبوت قرآن سے لیکن اسلام نے شریعت کو جامعیت کا رنگ دیکر ایک ہمہ گیر روشنی کی بنیاد ڈالی جس میں دین و ملک اور دیانت و سیاست مخلوط کر کے پیش کی گئی اور ایک بین الاقوامی دین پیش کیا

جس کی روشنی بین الاقوامی اور ہمہ گیر تھی۔ اس لئے یہ دین بھی ہمہ گیر ہوا اور اس کی سیاست و خلافت بھی ہمہ گیر ہوئی۔ دین کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد حق ہے کہ

ھوالذی ارسل رسولہ بالھدے و دین الحق لیظھرہ علے الدین کلہ۔	وہ (اللہ رب العزت) وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت و دین حق دیکر بھیجا تاکہ دنیا کے تمام دینوں پر اسے غالب کرے۔

اور دین کی سیاست و خلافت کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد نبوی ہے کہ

ان اللہ زوی لی الارض مشارقھا و مغاربھا وسیبلغ ملک امتی ما زوی لی منھا۔	اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے کردی (جسے میں نے دیکھا) اور عنقریب میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک میری نگاہ ہوئے دیکھا (یعنی مشرق سے مغرب تک)

چنانچہ اس رویت و مشاہدہ کی تفصیل اس حدیث میں فرمادی گئی کہ غزوۂ خندق میں جب ایک بڑی چٹان خندق کھودتے ہوئے نکلی اور حضرت سلمان فارسی اور دوسرے صحابہ اس کو توڑنے سے عاجز آئے تو حضور کو اطلاع دی تو آپ نے تشریف لاکر اس پر کدال سے ایک ایسی شدید ضرب لگائی کہ اس کا ایک بڑا حصہ ٹوٹ گیا پھر دوسری ضرب لگائی تو دوسرا حصہ ٹوٹا اور تیسری ضرب میں اُسے چکنا چور کردیا۔ ان تینوں ضربوں کی چوٹ میں ہر دفعہ ایک عظیم نور اور چاندنا ہو ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ پہلی ضرب کی روشنی میں مجھے حیرہ کے محلات اور مدائن کسریٰ (ایران) دکھلائے اور حضرت جبرئیل نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کی امت ان پر غالب آئے گی۔ دوسری ضرب کی روشنی میں مجھے روم کے سُرخ محلات نظر پڑے

اور حضرت جبریل نے فرمایا کہ آپ کی امت ان پر غالب آئے گی اور تیسری ضرب کی روشنی میں مجھے صنعاء (اور یمن کا علاقہ) دکھلایا گیا اور حضرت جبریل نے فرمایا کہ آپ کی امت اُسپر غالب آئے گی ۔

اس دور میں دنیا دو طاقتوں میں بٹی ہوئی تھی روم اور فارس، باقی ساری سلطنتیں ان ہی دو کے زیر اثر تھیں اسلام نے انھیں مغلوب کر کے اس وقت کی ساری دنیا پر اپنے مقتدرانہ اثرات قائم کئے اور نبوت کی پیشگوئی کا ایک بڑا حصہ پورا ہو کر دنیا کے سامنے آگیا اور آج کی دنیا تین بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے امریکہ، روس اور عرب ممالک اور موجودہ دنیا کا نقشہ صاف بتلا رہا ہے کہ آج کی دو عظیم بلاکوں امریکہ اور روس کے لئے عرب ممالک پاسنگ بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں بلاک عرب طاقتوں کی چاپلوسی یا ان کے ٹکڑے کے درپے ہیں۔ مگر یہ تیسرا بلاک طاقت پکڑتا جا رہا ہے اور بالآخر ان دو بلاکوں پر غالب ہو کر پوری دنیا پر چھا جائے گا۔ چنانچہ ظہور مہدی کی حدیثوں میں یہی خبر دی گئی ہے کہ مہدی کے ہاتھ پر مشرق و مغرب کی طاقتیں ٹوٹیں گی اور ان کی عالمی حکومت قائم ہوگی اور ظاہر ہے کہ مہدی کا ظہور مکہ سے ہوگا اور شام کو وہ اپنا مستقر بنا کر دینی طاقت جمع کریں گے جن سے روم و فارس نبرد آزما ہوں گے اور شکست کھا کر اسلام کی ایک ہی قومیت میں مدغم ہو جائیں گے۔ فیکون الدین کلہٗ للہ اور لیظہرہٗ علی الدین کلہٖ کا ظہور ہو جائے گا جس کی تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں اور ہم نے کسی دوسری جگہ اس کی تفصیلات واضح بھی کر دی ہیں۔

غرض آسمان نبوت کے تمام نجوم ہدایت ملکر رات کو دن نہیں بنا سکے

یہ کام صرف آفتاب نبوت ہی کا تھا کہ اس نے طلوع ہوتے ہی پوری دنیا کو اپنی روشنی سے جگمگا دیا اور اس کی عالمگیر روشنی عالم کے کونہ کونہ میں پھیلی اور پھیل کر رہے گی کیونکہ اس میں دیانت و سیاست ملک اور دین شوکت اور فروتنی تکمیل خرد و قوم تنظیم ملت اور نظام عالم طبیعت و عقل سب کچھ وحی کے نیچے جمع کر کے مجموعہ کے مزاج سے دین کی بنیاد استوار کی گئی ہے۔ اس لئے وہ عالم کے ہر طبقہ اور ہر مزاج کے لئے قابل قبول بن گیا جو ہمہ گیری کی ابتدائی شان ہے۔

مومن کا ایمانی وجود اور اس کی ذات اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح آفتاب کون و مکان کو روشن اور گرم کر دیتا ہے مگر حقیقتاً روشن اور گرم صرف آفتاب ہی ہوتا ہے اس کے سوا دوسری اشیاء عارضی طور پر روشن اور گرم ہو جاتی ہیں اور نظر یوں آنے لگتا ہے کہ یہ اشیاء روشن ہیں مگر بنگاہ حقیقت روشنی اور گرمی ایک آفتاب ہی میں ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو لگ جاتی ہے تو لگے رہنے کی حد تک وہ چیز بھی روشن اور گرم محسوس ہونے لگتی ہے۔ روز روشن میں در و دیوار کو ہم روشن اور گرم کہتے ہیں لیکن حقیقتاً دیوار روشن نہیں ہوتی دھوپ روشن ہوتی ہے مگر وہ دیوار سے لگی ہوئی ہے اس لئے دیوار بھی روشن نظر آ رہی ہے۔ اگر مغرب کے وقت آفتاب اپنی دھوپ کو سمیٹ کر لیجائے تو یہی دیوار جب بھی ہو گی مگر تاریک رہ جائے گی اس سے واضح ہے کہ روشن دیوار میں روشنی خود دیوار کی نہیں دھوپ کی ہے اور روشن ہے ہی فی الحقیقت دھوپ نہ کہ دیوار۔ دیوار کا کام اتنا ہی ہے کہ دھوپ سے لگی رہے

اور کنکشن صحیح رکھے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع ہو جانے کے بعد ایمان کی روشنی اور گرمی درحقیقت صرف خاتم الانبیاءؐ کی ہے وہی اصل مومن ہیں وہی اصل ہیں منور ہیں ہم اور تم مومن کہلاتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ اس آفتاب ایمان کی ایمانی دھوپ ہم پر پڑی ہوئی ہے۔ تو ہم مومن کہلانے لگے ورنہ حقیقتاً مومن صرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ البتہ جب تک ہمارا کنکشن آپ سے صحیح ہے اتباع و پیروی موجود ہے ذہنی بھی اور خارجی بھی ہم بھی مومن کہلائے جائیں گے ورنہ یہ ایمان جو ہم میں نظر آتا ہے محض پرتوہ ہے ایمان محمدی کا مستقل ایمان نہیں اگر عیاذاً باللہ دامن اتباع چھوٹ جائے اور آفتاب نبوت ہم سے کنارہ کرلے تو پھر بھی ہماری ذات تو باقی رہے گی مگر ایمان باقی نہ رہے گا یعنی آدمی کہلائیں گے مومن نہیں کہلائیں گے۔ پس ہمارے مومن ہونے کے معنی یہ نکلے کہ ہم آفتاب نبوت کی ایمانی دھوپ اپنے اوپر اور اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مومن ہونے کی حیثیت سے ہم خود اپنے سے اتنے قریب نہیں جتنے حضور اکرم ہم سے قریب ہیں کیونکہ جب ہم مومن ہونے کی حیثیت سے اپنے کو پہچنوائیں گے تو اس کے سوا کیا کہیں گے کہ میں نبی کا غلام اور امتی ہوں یعنی شخصیت مقدسہ کی طرف اپنی نسبت کردیں گے یہ نہیں کہیں گے کہ میں موحد ہوں میں آخرت کا ماننے والا ہوں میں خدا کو ماننے والا ہوں کیونکہ یہ سب دعوے غیر مسلم بھی کرسکتے ہیں ہاں غیر مسلم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم مطیعان محمدی ہیں یہ صرف مسلم ہی کرسکتا ہے جس سے واضح ہے کہ مسلم و غیر مسلم میں امتیاز اتباع محمدی و عدم اتباع محمدی

سے ہے! اور جبکہ ہماری حقیقت ہی یہ نکلی کہ ہم محمدی مطیع ہیں تو ہماری حقیقت میں پہلے حضور کا ذکر آیا پھر ہمارے نفس کا ذکر آیا۔ تو حضور ہم سے اتنے قریب نکلے کہ ہم خود بھی اپنے سے اتنے قریب نہیں۔ جیسا کہ دھوپ کے ٹکڑوں سے اگر کوئی پوچھے کہ تو کون ہے؟ تو وہ اس کے سوا کیا جواب دے سکتی ہے کہ آفتاب کا ایک پرتو کیونکہ اس سے الگ ہٹ کر دھوپ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ تو آفتاب دھوپ کے نفس سے اتنا قریب نکلا کہ خود دھوپ بھی اپنے نفس سے اتنی قریب نہیں ہے۔ پس اسی طرح مومن سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے تو وہ اس کے سوا کچھ جواب نہ دے سکے گا کہ میں غلام محمدی ہوں گویا اس کے ایمانی وجود کے معنی ہی غلامی محمدی کے ہیں۔ پس مومن اپنے وجود میں خود اپنے سے اتنا نزدیک نہیں جتنا کہ اس سے حضور اکرم نزدیک ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ فرمایا۔

النبی اولٰی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہٗ امھاتھم	نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

یہاں سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے جو اس زمانہ کے بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ مسلم و غیر مسلم بحیثیت دین کے سب ایک ہیں سب کا ایک ہی مقصد ایک ہی منتہا اور ایک ہی منزلِ مقصود ہے۔ راستوں کا فرق ہے۔ اس فرق سے اقوام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو واضح ہو گیا کہ بلا شبہ منزلِ مقصود اللہ تک پہنچنا ہے۔ لیکن یہ پہنچنا راستہ ہی کی استقامت سے ممکن ہے راستہ اگر غلط ہے تو وصول بہ منزل ناممکن ہے پس مذاہب کا حق و باطل ابتداءً مقصد کے اعتبار سے نہیں دیکھا جائیگا

راستہ کے لحاظ سے دیکھا جائیگا جس کا معیار اتباع نبوت ہوگا۔ کیونکہ راستہ نبی کی خبر کے بغیر متعین ہونا ناممکن ہے۔ خدا کا راستہ خدا ہی بتلا سکتا ہے۔ اور خدا کا بتلانا پیغمبروں کے توسط سے ہے۔ ہر ایک انسان سے براہ راست خدا کلام نہیں فرماتا اس لئے راستہ کی تعیین میں پیغمبری کا اتباع ناگزیر ہوگا اور راستہ متعین ہوئے بغیر منزل مقصود تک پہونچنا ناممکن ہوگا اس لئے وصول بہ منزل کے لئے پیروی نبوت لازمی ہو جاتی ہے۔ اور جب مقصود اصلی منزل کے صحیح راستہ سے منزل تک پہونچنا ہے منزل کا دعویٰ کرنا یا اس کا اعلان کرنا نہیں اس لئے وہ اقوام جو مستند طریقہ پر نبوت کی پیروی نہیں کرتیں منزل مقصود کا محض دعوے کرتی ہیں نہ اس کا راستہ جانتی ہیں اور نہ منزل تک پہنچنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔

آفتاب نبوت کی پیروی میں نجاۃ کا انحصار پس جیسے طلوع آفتاب کے بعد نور کا ملنا بجز آفتاب کے کسی ستارہ سے ممکن نہیں اور جو بھی طلوع کے بعد کسی ستارہ کے نور کا سہارا ڈھونڈے گا وہ نور سے محروم رہیگا ایسے ہی ظہور محمدی کے بعد جو بھی نجات کے سلسلہ میں کسی نجم نبوت کا سہارا ڈھونڈیگا وہ یقیناً نجاۃ سے محروم رہیگا۔ نجات نام دعوائے مقصد کا نہیں حصول مقصد کا ہے اور وہ بغیر نبیٔ وقت کی پیروی اور اتباع سبیل کے ناممکن ہے۔ اسی لئے آج جبکہ آفتاب نبوت طلوع ہو چکا ہے دنیا کی نجات آخرت اور فلاح دنیا صرف اسی آفتاب نبوت کی روشنی سے مستفید ہونے اور اسی کے نیچے آکر کھڑا ہونے سے ممکن ہے دن میں کسی اور ستارے کے نور کا سہارا ڈھونڈھنا نور سے محروم رہجانا ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

آفتاب نبوت اور خلافت مگر ظاہر ہے کہ جب ظہور ختم نبوت بمنزلہ دن کے ہے کیونکہ وہی آفتاب نبوت کے طلوع کا زمانہ ہے تو اس سے خود بخود مفہوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں برس کی رات کے بعد آفتاب نبوت طلوع ہوا جس سے دن نکلا تو اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ آفتاب نبوت کے غروب کے بعد دن چھپے اور رات آجائے پس جیسے آفتاب نبوت کا طلوع ولادت شریفہ تھی ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب وفات شریف ہے جس سے آپ نے اس جہان سے پردہ فرمالیا ہے۔ اور یہ سورج عالم غیب میں جاکر چھپ گیا۔

سوال ہوتا ہے کہ آپ کے پردہ کر لینے سے کیا اسلام کی روشنی منقطع ہوگئی یا اس رات میں بھی روشنی کی کوئی صورت باقی رہی جس سے دنیا کا یا اندھیرا اندھیرا نہ رہا؟ جواب یہ ہے کہ جس طرح مادی آفتاب غروب کے بعد بھی دنیا کو خالص اندھیرے میں نہیں چھوڑتا بلکہ ستارے اس کے خلفاء ہیں جو اسی سے نور لیتے ہیں اور دنیا کو دیتے ہیں ان میں کوئی چاند ہے جو آفتاب سے اشبہ اور اس کی صفات سے بہت قریب ہے گویا اس کا خلیفۂ اعظم ہے جس کا نور آفتاب ہی کی طرح پھیلتا اور نورانی سایہ (چاندنی) لیکر آتا ہے جو دھوپ کے مشابہ ہے۔ اور دوسرے کسی ستارے میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے چاندنی رات میں صرف چاند ہی کافی ہو جاتا ہے دوسرے ستارے اس کے سامنے ماند رہتے ہیں البتہ اس کے غروب کے بعد چھوٹے بڑے مختلف ستارے مل کر کام کرتے ہیں جن کا مجموعی نور رہنما ہوتا ہے اور رات

میں بھی کام بند نہیں ہوتا بالخصوص جبکہ مشینی دور ہو تو مشینیں چلتی رہتی ہیں اور دن کا سا کام ہوتا رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے غروب ہونے پر دنیا میں بلاشبہ اندھیرا چھا گیا لیکن پھر بھی آفتاب نبوت کا نور منقطع نہیں ہوا اور اس نے غروب ہو کر بھی دنیا کو محض اندھیاری میں نہیں چھوڑ دیا بلکہ صحابیت کے روشن ماہ پاروں اور ستاروں کو اپنا خلیفہ بناتے ہوئے پہلے ہی سے فرما دیا تھا کہ

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم — میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کا بھی دامن سنبھال لوگے ہدایت پا جاؤ گے۔

پس جیسے ستاروں کا نور خود اپنا نہیں ہوتا بلکہ آفتاب ہی کا نور ان میں کام کرتا ہے اور ہر ظرف کے مطابق اس نور کا رنگ اور خاصیت الگ الگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صحابہ ہیں۔ نور علم و اخلاق خود اپنا ذاتی نہ تھا بلکہ وہ آفتاب نبوت کے نور علم عرفان ہی کی جلوہ گری تھی البتہ ان کے قلوب و دماغ کی ساخت اور ظرف کی خصوصیات کے مطابق اس نور کا ڈھلاؤ ان میں ہوا تو رنگ الگ الگ ہو گئے مگر وہ سب رنگ آفتاب نبوت ہی کے تھے کسی میں شجاعت کا غلبہ ہوا جیسے خالد سیف اللہ کسی میں سخاوت کا غلبہ ہوا جیسے عبدالرحمن بن عوف کسی میں سیاست کا غلبہ ہوا جیسے عمر بن خطاب کسی میں زہد کا غلبہ ہوا جیسے ابوذر غفاری کسی میں دانش و عرفان کا غلبہ ہوا جیسے حضرت علی، کسی میں تفقہ کا غلبہ ہوا جیسے ابن مسعود کسی میں اجتہاد کا غلبہ ہوا جیسے عبادلۂ اربعہ کسی میں ملوکیت عادلہ کی شان آگئی جیسے امیر معاویہ اور کوئی جامع

شؤن نبوت ہوا جو آفتاب نبوت سے اشبہ تھا جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ
وہ بمنزلۂ چاند کے ہیں جو آفتاب نبوت کے بلا واسطہ خلیفہ اور ظل نبوت ہیں
جو غلبۂ رحمت میں رحمۃ للعالمین کے اشبہ اور نمونۂ نبوت ہیں اس چاند کا نورانی
سایہ سورج ہی کے نورانی سایہ کے مشابہ دنیا میں پھیلا جیسے چاندنی دھوپ
کی طرح پھیل جاتی ہے۔ فرق صرف رنگ اور کیفیت اور قوت و ضعف کا ہے
دوسرے صحابہ بھی بحیثیت مجموعی خلفاء ہیں جو بڑے چھوٹے ستاروں کی مانند
ہیں اور سب کے سب نجوم ہدایت ہیں۔ گو ان سے چاندنی اس طرح نہیں پھیلتی
جس طرح چاند سے پھیلتی ہے۔ پس نبوت تو ختم ہو گئی۔ مگر خلافت اس کے قائم
مقام ہو گئی جو نور نبوت ہی سے مستفید تھی مگر روشنی اور تاثیر میں تفاوت
اور فرق مراتب ناگزیر تھا۔ تاہم دنیا سے آفتاب نبوت کا نور کم نہیں ہوا بلکہ
ہزاروں ستاروں کے پردوں سے چھن چھن کر ضو، فشانی کرتا رہا اور کرتا رہیگا
یہ رات ضرور آئی مگر روشن رات تھی جیسے لیلہا کنھارہا (اس کی رات بھی دن کی
مانند ہے) کا مصداق کہنا چاہئے۔ اس لئے اسلامی عمل اس روشنی میں بدستور
جاری رہا اور رہیگا ہاں پھر یہ رات بھی غیر معمولی طور پر لمبی ہے۔ نیز یہ سیکڑوں
برس کی رات ہوگی جو یوم قیامت سے پہلے ختم نہیں ہوگی البتہ جب آفتاب
نبوت ہی محشر میں طلوع کرے گا تب ہی دن نکلے گا جسے یوم قیامت اور صبح
قیامت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ دن دنیا کی ان دونوں راتوں اور دن
سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا جس میں ساری دنیا کی زندگی پوری کی پوری دہرادی جائیگی
تاکہ اولین و آخرین پر آفتاب نبوۃ کا فیضان عام جو ازل سے ہوتا آرہا تھا سب کی آنکھوں

کے سامنے آجائے چنانچہ اس دن ایک ہی جھنڈا بنام (لواء الحمد) ہوگا جس کے تلے سب انبیاء و امم جمع ہوں گے۔ ایک ہی شفاعت کبریٰ ہوگی جس کے سایہ عاطفت میں تمام امتیں آجائیں گی۔ ایک ہی دست مبارک ہوگا جو جنت کا قفل کھولے گا اور سب نجات یافتہ اقوام کو داخلۂ جنت کا راستہ ملیگا جیسے ازل میں بھی ہی ایک زبان تھی جس کے ازل میں عہد الست کے وقت بلیٰ پکارنے سے سبکی زبانوں پر بلیٰ کا نعرہ بلند ہوا پھر ایک ہی ذات تھی جس نے بلیٰ کہکر اپنے عشق و محبت خداوندی کا ثبوت سب سے پہلے دیا اور اسی کی پیروی سب نے کی گویا آپ ہی نے تعلیم توحید کے ساتھ قلوب کو عشق و محبت الٰہی کی گرمی سے گرمایا اور سب سے پہلے عشقی اخلاق سے خلق اللہ کی تربیت کی یا مخلوق کے اندر عشق الٰہی کی دبی ہوئی آگ کو سلگایا اور ابھار دیا پھر دنیا میں ایک ہی ذات کا علمی معجزہ (قرآن) تھا جو پچھلوں کی کتابوں میں روح بن کر دوڑتا رہا۔

وانہ لفی زبر الاولین اور اسی قرآن کی روح پچھلوں کی کتابوں میں بھی اور اگلوں کے دلوں میں نور بن کر چمکا پس ایک ہی آفتاب نبوت کی ضیا باری تھی جو ازل اور ابد میں نمایاں ہوتی رہی اور اولین و آخرین کو روشنی دکھاتی رہی جسے قیامت کے دن جمع شدہ اولین و آخرین کے سامنے علیٰ رؤس الاشہاد کھولدیا جائیگا۔ پس وہ دن بھی آفتاب نبوت ہی کے طلوع سے نمایاں ہوگا جس میں ساری حقائق روشن کردی جائیں گی۔

انحصار نجات بہرحال کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے یہ نمایاں ہے کہ جس طرح مادی جہانوں میں رہ کر مادی آفتاب سے چارۂ کار نہیں ایسے ہی روحانی عالمیں

میں لیکر روحانی آفتاب (آفتاب نبوت) سے چارہ کار نہیں ہو سکتا دن ہو یا رات واسطہ بلا واسطہ روشنی اسی کی کام کرتی ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ جیسے مادی عالم میں مادی آفتاب کے سایہ کے نیچے آئے بغیر مادی ظلمتوں اور ظلمانی آفات سے نجات ممکن نہیں ایسے ہی روحانی جہانوں میں آفتاب نبوت کے دامن تلے آئے بغیر معنوی ظلمات و آفات، جہل و ظلم، شبہات و شہوات اور فتنۂ علم و عمل سے نجات ممکن نہیں یعنی آفتاب نبوت کے دور دورہ کے بعد اس کو چھوڑ کر کوئی دوسری روشنی اور ہدایت کار آمد نہیں ہو سکتی نجات کا انحصار صرف اسی کی لائی ہوئی روشنی میں منحصر ہے۔

گو پچھلے مذاہب اور انبیائے سابقین کی تعلیمات اپنے اپنے وقت میں سچی اور حق تھیں لیکن خاتم النبیین کے دورہ کے بعد اب ان میں نجات ڈھونڈھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد کوئی روپوش شدہ ستارہ کو ڈھونڈھنے اور ان کی روشنی میں راہ چلنے یا راہ پانے کا منصوبہ باندھنے لگے تو اول تو آفتاب کی تیز روشنی میں اسے کوئی ستارہ دکھائی ہی نہیں دے گا چہ جائیکہ اس کی روشنی دستیاب ہو۔ اور اگر بالفرض آنکھوں نے گھور گھار کر آسمان کا کوئی ستارہ ڈھونڈھ ہی نکالا تو آفتاب کے ہمہ گیر نور میں اس کی گم شدہ روشنی سامنے نہیں آسکے گی کہ وہ اس میں راستہ طے کرے اور اگر بالفرض وہ اپنے خیال سے کسی حد تک اس میں بھی کامیاب ہو جائے تو پھر بھی وہ راستہ آفتاب ہی کی روشنی میں طے کریگا نہ کہ اس گم شدہ ستارہ کی روشنی میں تو اسے خیالی راہ پیمائی کہیں گے کیونکہ اس جزوی روشنی کا تشخص اور الگ ہو کر نظر آنا سورج کی کلی روشنی میں ممکن

ہی نہیں۔ اس لئے روشنی حاصل کرنے کا راستہ بجز آفتاب کے سامنے حاضر ہوئے دوسرا نہیں ہوسکتا اور اس سے الگ رہ کر نجات ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم نے علی الاعلان دین کی قبولیت عند اللہ کا انحصار صرف آفتاب نبوت ہی کی روشنی میں (جس کا نام اسلام ہے) منحصر بتلایا ہے۔ فرمایا۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین۔	اور جو بھی (اسلام آجانے کے بعد) اسلام کے سوا کوئی دین ڈھونڈیگا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جاویگا۔ اور وہ آخرت میں گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں پہنچکر سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن نے نجات کو صرف اسلام میں منحصر کردیا ہے۔ اور دوسری طرف اسی کا یہ اعلان بھی ہے کہ یہ سب مذاہب اپنے اپنے وقت میں سچے اور برحق تھے جن کی سچائی پر آج بھی ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مذہب اسلام پر ضروری ہے۔ تو پھر ان پر عمل کرتے اور انھیں دستور زندگی بنانے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ درحالیکہ وہ مسلمہ طریق پر حق تھے۔ اور اب بھی ان میں سے کلیۃً حق نکل جا دیگا اعلان نہیں کیا جا رہا ہے؟ غور کیا جائے تو اشکال کا حل بھی اسی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے اور وہ اس طرح کہ اسلام میں نجات کا انحصار مذاہب سابقہ کے بطلان یا ناحق ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ ان کے منسوخ کرد ئے جانے کی بناء پر ہے اور نسخ کے معنی ابطال کے نہیں بلکہ انتہاء مدت کے ہیں یعنی اس سابقہ شریعت کی مدت ہی اتنی تھی اور وہ اتنے ہی وقت کے لئے آئی تھی۔ آخر خود قرآن و حدیث میں بھی تو نسخ موجود ہے اور بعض آیتوں یا روایتوں نے بعض آیات و روایات کو منسوخ

قرار دیا ہے نہ اس لئے کہ وہ معاذ اللہ غلط یا باطل تھیں بلکہ اس لیئے کہ ان کے حکم یا تلاوت کا وقت ہی اتنا تھا، وہ وقت گذر گیا تو ان کا عمل بھی ختم ہوگیا، اسی طرح سابقہ شریعتوں کا مقررہ وقت اور دور پورا ہو جانے کے بعد ان کا حکم اور عمل بھی ختم ہوگیا، نئے وقت نے نئے حالات اور نئے ذہن پیدا کر دیئے جو نئے احکام کے متقاضی تھے۔ اس لئے سابقہ ہدایتیں باوجود حق ہونے کے اب کارآمد نہ رہیں تو ان کی قانونی حیثیت ختم کر دی گئی اور نئے احکام لے آئے گئے۔ پس ان کی دستوری حیثیت کا ختم کر دیا جانا ان کے غلط ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ وقت مقررہ ختم ہو جانے اور موافق حال نہ رہنے کی بنا پر ہے۔

یہ ایسا ہی جیسا کہ ایک حاذق طبیب اپنے مریض میں مادہ کا ہیجان محسوس کر کے اولاً دس بیس دن اسے منضج پلائے پھر اسے ترک کرا کر نو دنوں میں تین مسہل پلائے اور پھر انھیں بھی ترک کرا کر نو دن تبرید کا نسخہ استعمال کرائے اور پھر اسے بھی ترک کرا کر ایک مہینہ مقویات کھلائے اور پھر انہیں بھی چھڑا کر روزمرہ کی غذا پر لگا دے جو عادۃً ہر صحت مند انسان بارہ مہینہ کھاتا ہے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ دس بیس دن میں منضج کا چھڑا دینا اور نو دن کے بعد مسہل کے نسخہ کا ترک کرا دینا اور پھر نو دن کے بعد تبرید ترک کرا دینا اور آخر کار مقویات کے نسخوں کو بھی منسوخ کر دینا ان سب نسخوں کے غلط ہونے کی بنا پر تھا اور گویا طبیب نے اپنی دانست میں غلطی کی تھی جس سے وہ نادم ہوتا رہا اور ان غلط نسخوں کو چھڑاتا رہا؟ نہیں بلکہ یہ کہا جائیگا کہ طبیب نے اپنے وقت پر تمام نسخے صحیح استعمال کرائے لیکن ہر نسخہ ایک مقررہ وقت کے لئے تھا اور وقت کی تحدید اس لئے تھی کہ اس مریض کی طبیعت کی تبدیلیاں

اور صحت کی طرف اس کے رُخ کے مائل ہوتے رہنے کے یہ اوقات طبعی تھے۔
جیسے جیسے وقت گذرتے رہتے پر مریض کی طبیعت بدلتی رہی اور متبادل نسخے
اس کی صحت کی استعداد کو تدریجاً آگے بڑھاتے رہے ایسے ایسے سابقہ نسخے
منسوخ ہوتے رہے اور اس کی جگہ نئے نسخے لیتے رہے اور جب ان متبادل نسخوں سے
اصل صحت حاصل ہو گئی تو سارے نسخے مریض کے حق میں ختم کر کے اصل غذا
پر اس کا قرار و استقرار عمل میں آگیا پس یہاں نسخوں کے غلط یا باطل ہونے کا کوئی
سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح عالم بشریت دنیا کے تغیرات سے ایک مریض نفس کی
مانند ہے اور انبیاء علیہم السلام اس کے معالج ہیں کسی روحانی طبیب نے اسے روحانی
منضج پلایا تاکہ اخلاق ردیہ کا مادہ پک کر قابل اخراج ہو جائے۔ کسی نے مسہل دیا
کہ مادہ اخراج ہو جائے کسی نے تبرید کا نسخہ دیا کہ مسہل سے پیدا شدہ گرمی خارج
ہو جائے کسی نے مقویات دئے کہ روح میں قوت آجائے اور کسی نے اصل فطری
غذاؤں سے علاج کیا کہ بقاء حیات بھی ہو اور رفع مرض بھی ہو جائے۔ پھر اس
عالم بشریت کے اعضاء مختلف اقوام ہیں اور ہر قوم کا مرض جداگانہ ہے جیسے ہر
عضو کی بیماری اس کے ہی مناسب حال الگ الگ ہوتی ہے اور جیسے ہر
مرض کے ماہر ڈاکٹر جدا جدا ہوتے ہیں جو خاص اسی عضو کا علاج کرتے ہیں۔
اسی طرح دنیا میں یہ اطبائے روحانی (انبیاء علیہم السلام) مختلف اقوام اور مختلف
خطوں میں تشریف لائے اور اسی قوم کے مخصوص امراض کے لئے مخصوص قسم کے
نسخے ساتھ لائے جن سے قومیں حسب استعمال دوا شفاء پاتی رہیں جو در حقیقت

اس عالم بشریت کی صحت تھی اس لئے عالم بشریت ان اطبائے روحانی کے مختلف المزاج نسخے استعمال کر کر کے صحت مندی کی طرف بڑھتا رہا اور جو نسخہ اپنی تاثیر دکھلا کر ان اعضاء بشریت کو صحت کی طرف بڑھاتا رہا تاکہ اگلا نسخہ اگلا عمل کرے تو وہ سابقہ نسخہ نیا نسخہ آنے کے بعد ختم ہوتا رہا اور نیا اس کی جگہ سنبھالتا رہا پس نیا نسخہ چونکہ اپنا عمل اس استعداد پر کرتا تھا جو پہلا نسخہ پیدا کر چکتا تھا اس لئے پہلے نسخہ کو غلط نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ اپنے وقت میں اس لئے ضروری اور صحیح اور مناسب وقت تھا کہ اس کی کارفرمائی کے بغیر نئے نسخہ کی کارفرمائی ظاہر ہی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ان سابقہ نسخوں کی منسوخی کے معنے ان کے باطل ہونے کے نہ ہوں گے بلکہ موقت ہونے کے ہوں گے جس کا ختم ہو جانا خاتمۂ وقت پر ضروری اور لوازم علاج بدن سے تھا جو اس کے صحیح اور جزو طب ہونے کی دلیل ہے نہ کہ باطل یا خارج از طب ہونے کی پس یہ نہیں کہا جائیگا کہ سابقہ نسخہ کی تبدیلی میں طبیب کو ندامت کے ساتھ رجوع کرنا پڑا اور اس نے اپنی غلطی محسوس کر کے نسخہ بدلا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ لائق طبیب کے ذہن میں پہلے ہی سے اس نسخہ کا وقت اتنا ہی تھا جب سابقہ دوا اپنا کام کر چکی اور اس سے صحت کا ایک خاص درجہ آپہنچا جو مقصود تھا تو طبیب نے اسے چھڑا دیا کہ اب اس کا استعمال مریض کے موجودہ مزاج کے لئے مضر تھا یہی صورت شرائع سابقہ اور شرائع مابعد کی بھی ہے کہ حکیم مطلق کے علم ازلی میں ان سابقہ مذاہب کے شرعی نسخوں کی نفع رسانی کا مقررہ وقت پورا ہوتے رہنے پر اصول طب کو بدستور باقی رکھ کر یہ شرعی نسخے بدلے جاتے ہے جبکہ وہ آنے والی دنیا کے مزاج اور اس کی ترقی پذیر ہیئت کے حسب حال نہ رہے تھے۔

اس لئے نسخ شرائع کے معنی تغلیط شرائع یا ابطال مذاہب کے نہ ہوں گے بلکہ انتہار مدت کے ہوں گے جو تبدیل ذہنیت کے معیار سے ہوتی رہی ہے۔

خود اسلام میں بھی کتنی ہی شرائع اپنے ابتدائی اوقات میں اس رنگ کی نہ تھیں جس پر وہ آخر کار آکر رکیں اور ٹھہر گئیں مثلاً ابتداء اسلام میں نماز میں نقل و حرکت سلام و کلام اور رُخ کا ہیر پھیر اور تخاطب و مکالمہ سب جائز تھا لیکن جیسے جیسے ذہنیت تربیت یافتہ ہو کر ترقی یافتہ ہوتی رہی اور اس حد پر آگئی کہ نماز کی شائستگیوں کو اٹھا سکے ویسے یہ سب آزادیاں بتدریج منسوخ ہوتی گئیں اور وہ ترقی یافتہ ہیئتہ آخر کار آکر پائیدار اور برقرار ہو گئی جو ازل سے شارع حقیقی کی نگاہ میں متعین تھی۔ تو کیا یہ کہا جائیگا کہ نماز کی یہ ابتدائی صورتیں معاذ اللہ باطل تھیں؟ نہیں ورنہ ان کا اجرار و نفاذ ان پر اجر و ثواب کا وعدہ اور ان کے حق میں قبولیت عند اللہ کا وعدہ کیوں ہوتا؟ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس وقت کی قوم اور ابتدائی ذہنیت کے لئے وہ کافی ضرور تھیں مگر خود نا تمام تھیں کیونکہ فی الحقیقت ذہن ہی نئی قوم کا ابتدار میں نا تمام تھا جتنا جتنا نئی قوم کا مزاج اور ذہن اسلامی رنگ کے لحاظ سے شائستہ سنجیدہ اور پختہ ہوتا گیا اتنی اتنی آخری اور مطلوب ہئیتیں آکر قائم ہوتی گئیں جو پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ تھیں۔

اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لئے یہ مثال کافی ہو گی کہ ایک نو پیدا بچہ کے لئے قدرت نے ان کے دودھ کی غذا تجویز کی جب وہ دو برس کا ہو گیا اور کچے دانت نکل آئے تو شیر خواری منسوخ کر کے ہلکی غذائیں رکھیں جو بچہ ہضم کر سکے

جب پکے دانت نکل آئے اور ثقیل و سخت غذائیں ہضم کرنے کی قوت اسے ملگئی تو یہ بھی منسوخ ہو کر آخر کار وہی غذائیں آگئیں اور باقی رہ گئیں جو عادۃً سارے انسان استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ کہا جائے گا کہ معاذ اللہ تو پید بچہ کے لئے شیر خواری تجویز کرنے میں قدرت نے غلطی کی تھی جسے دو برس کے بعد منسوخ کرنا پڑا یا پانچ سالہ بچہ کے حق میں ہلکی پھلکی نرم غذاؤں کی منسوخی اس لئے عمل میں آئی کہ وہ غلط تھیں ؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ بچے کے حالات کے لحاظ سے یہ منسوخ شدہ غذائیں اتنے ہی اوقات کے لئے رکھی گئی تھیں جب وہ وقت اور حال گذر گیا اور بچہ کی ابتدائی حالت تبدیل ہو کر قوۃ حدِ کمال پر آگئی تو وہ غذائیں بھی گذر گئیں اور وہی کامل غذائیں آگئیں جو ایک پختہ انسان کے لئے ہوتی ہیں اور مرتے دم تک رہتی ہیں - آپ اسی طرح عالم بشریت کو بھی سمجھ لیں کہ اس پر بھی ایک دورِ طفلی کا گذرا ہے جو آدم و نوح علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ ہے اس لئے اس وقت کی تعلیم و عبادت بھی مختصر اور ہلکی پھلکی تھی تعلیم کے درجہ میں صرف اشیاء کے نام سکھلا دیئے گئے جو آدم علیہ السلام کو تعلیم کئے گئے تھے وعلم آدم الاسماء کلھا اور عبادت کے درجہ میں فقط ایک وقت کی نماز اور وہ بھی صرف بصورت سجدہ بتلا دی گئی جیسے بچوں کو ابتداء میں چیزوں کے نام ہی بتلائے جاتے ہیں کہ یہ آسمان ہے یہ زمین یہ روٹی ہے اور یہ پانی وغیرہا اور عبادت کے سلسلہ میں کسی ایک آدھ وقت بھی بچہ کو اگر مسجد میں لے آتے ہیں تو اس کے حق میں اسے ہی بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور بطور حوصلہ افزائی کے کہا کرتے ہیں کہ ماشاءاللہ بچہ بڑا

نمازی ہو گیا ہے۔ مگر جیسے جیسے یہ عالم بشریت جوانی اور قوت کی طرف بڑھتا رہا اور اس کے ذہنی اور دماغی قوی قوی ہوتے گئے ویسے منضبط تر یعنی شریعتیں اترتی رہیں اور اصول کی بقاء کے ساتھ احکام اور عملی پروگرام میں حسب مزاج بشریت تبدیلی ہوتی گئی۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے احکام غلط تھے اس لئے وہ بدل دئیے گئے جیسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم غلط تھی اس لئے اسے منسوخ کر کے انتہائی تعلیم لائی گئی یا مثلاً بچہ ابتداء میں تتلائی ہوئی زبان سے بولتا ہے اور جوں جوں عمر آتی جاتی ہے زبان صاف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ پھر یہی "تتلا بچہ" زمانہ کا زبردست فصیح و بلیغ اور قادر الکلام خطیب بن جاتا ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدائی تتلاپن "بچہ" کے حق میں غلط تھا اس لئے قدرت نے اُسے زبان کی صفائی بخشی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ تتلاپن نو عمر بچہ کی زبان کی ابتدائی ساخت کا قدرتی تقاضا تھا اور صاف کلامی پختہ عمر کی زبان اور اس کے قویٰ کی ترقی کا قدرتی نتیجہ ہے جو اپنے اپنے وقت میں ضروری اور موزوں تھا اسی طرح شریعتوں کا ابتدائی دور اپنی ذات اور اپنی تعبیر کے لحاظ سے ابتدائی حالت میں تھا کہ عالم بشریت ہی ابتدائی حالت میں تھا جیسے جیسے عالم بشریت تکمیل قویٰ کی طرف بڑھتا رہا اسی طرح اس کی شریعتیں اور شریعتوں کی تعبیریں بھی کامل و مکمل ہوتی گئیں اب اگر اس ترقی پذیر رفتار سے اس کی شریعت اور اس کی تعبیر اپنی کسی ایسی آخری حد پر آجائے کہ اس کے بعد ترقی ممکن نہ ہو جس سے پچھلی شریعتیں اور تعبیریں متروک اور منسوخ ہو جائیں تو یہ تنسیخ و تبدیلی معاذ اللہ کسی احساس غلطی کا نتیجہ نہیں ہوگا بلکہ حالت کی ترقی پذیر رفتار

کا قدرتی تقاضا شمار ہوگا پس دین اگر اول سے آخر تک ایک ہی رہے لیکن اس کے نشو ونما کے لحاظ سے اس کے شرعی لباس بدلتے رہیں یہاں تک کہ جب نشو ونما مکمل ہو جائے تو لباس کی پیمائش ایک حد پر آکر رک جائے تو اس میں کیا قباحت اور کیا عقلی پیچیدگی ہے کہ اسے ماننا خلاف عقل یا خلاف طبع سمجھا جائے۔ آخر ایک نو پید بچہ کا پیدائش کے وقت لباس بالشت بھر سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جیسے جیسے بچہ بڑھتا رہتا ہے سابقہ لباس منسوخ ہو کر نئی نئی پیمائش کا لباس آتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پچیس تیس برس کی عمر میں جب اس کا نشو ونما مکمل ہو جاتا ہے تو لباس کی پیمائش بھی ایک خاص حد پر آکر رک جاتی ہے اور وہ آخری پیمائش بالآخر عمر بھر قائم رہتی ہے تو جس طرح یہ تبدیلی کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی احوال وعوارض کی بنا پر ہوتی ہے ایسے ہی دین کے شرعی لباس یعنی شرائع تبدیلی بھی دین کے قد وقامت کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے۔ معاذ اللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی اور جیسا کہ تدریجی ترقی اور پیا پے تبدیلی کے بعد اختتام نشو ونما پر آخر کی پیمائش قائم و دائم ہو جاتی ہے جس میں پھر تبدیلی نہیں ہوتی۔ پس دین کی تکمیل کے بعد قدرتاً یہ تبدیلی بند ہو کر آخری پائیدار حالت آجانی قدرتی ہے جو پھر تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اس سے صاف واضح ہے کہ شریعتوں کی تبدیلی دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کے تفاوت سے ہوئی۔ اور اس وقت تک ہوتی رہی جب تک کہ انسانی معاشرہ کا مجموعی مزاج حد کمال پر نہیں آگیا ذہن اور مزاج کی تکمیل ہوتے ہی قدرتی بات تھی کہ دین بھی کامل کر دیا جائے۔ شریعت بھی ناقابل تبدیل بھیجدی جائے۔ قوانین

احکام اور پروگرام بھی ناقابل تنسیخ اتار دیئے جائیں۔ بس وہی آخری اور قائم و دائم دین اور آخری شریعت اور آخری آئین و قانون خاتم النبیین کا دین و آئین ہے۔ جس کے بعد نہ نیا دین آئیگا نہ دین میں کمی بیشی ہو گی۔ اس کے بعد بھی سابقہ منسوخ شدہ شرائع میں نجات تلاش کرنا ایسا ہی ہو گا جیسا کہ کوئی مریض کے نسخے کے بعد لوٹ کر پھر منضج کے ابتدائی نسخہ میں شفا و صحت تلاش کرنے لگے یا کامل الغذاء انسان اپنی بقاء کے لئے لوٹ کر پھر ماں کا دودھ پینے لگے۔ یا ایک چھ فٹ کا انسان بدن کی راحت و زینت کے لئے لوٹ کر پھر وہی اپنی پیدائش کے وقت کا بالشت بھر کا کرتہ پہننے کی کوشش کرنے لگے یا ایک فاضل اور منتہی طالب علم پھر سے لوٹ کر صرف و نحو کی ابتدائی کتابوں سے علم کی تلاش میں لگ جائے یا ایک قادر الکلام خطیب پھر سے لوٹ کر بچپن کی تتلاتی ہوئی زبان بولنے میں فصاحت و بلاغت کا تخیل باندھنے لگے تو جیسے ان لوگوں کو اس ترقی معکوس کے تخیل پر احمق کہا جائے گا ایسے ہی دین کامل اور شریعت خاتم النبیین کے دور دورہ کے بعد ابتدائی شرائع میں نجات ڈھونڈھنے والے کو بھی اسی قسم کا کوئی خطاب دیا جا سکے گا۔

اگر آپ غور کریں تو یہ نسخ شرائع اور انحصار نجات کی حقیقت بھی اسی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے۔ کیونکہ آسمان پر کروڑوں ستارے یکے بعد دیگرے دنیا کو نور پہنچانے کے لئے طلوع ہوتے ہیں جن کا رنگ الگ ہوتا ہے اور تاثیر الگ جیسے جیسے بڑے ستارے آتے جاتے ہیں چھوٹے ستاروں کا نور اُن کے نور میں گم ہوتا رہتا ہے اور اب دنیا کی نگاہ صرف ان بڑے ہی ستاروں پر لگ جاتی ہے اور

انہی کی روشنی کو سامنے رکھ لیتی ہے۔ چھوٹے ستارے، نہ آنکھوں میں آتے ہیں نہ ان کی روشنی ہی سامنے ہوتی ہے پھر چاند نکلنے پر یہ بڑے ستارے بھی پھیکے بلکہ ایک حد تک بے نور سے نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی روشنی راہ نما باقی نہیں رہتی مگر آخر کار جب آفتاب نمایاں ہوتا ہے تو چاند بھی مونھ چھپا لیتا ہے اور پھر دنیا کی نگاہ کے سامنے ذات بھی اگر نمایاں ہوتی ہے تو سورج کی اور روشنی بھی دکھائی دیتی ہے تو صرف اسی کی تیز تاثیر (حرارت) بھی محسوس ہوتی ہے تو صرف اسی کی گویا نگاہوں میں نہ اب کوئی ستارہ باقی رہتا ہے نہ کسی کی روشنی اور تاثیر۔ ظاہر ہے کہ ستاروں کا نمایاں ہو کر چھپا دیا جانا معاذ اللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ قدرت نے ابتدائی ستاروں کی نمائش میں غلطی کی تھی جس سے آخر کار چاند اور پھر سورج کو لانا پڑا۔؟ نہیں بلکہ ابتدائے شب میں انسانی معاشرہ کے مزاج کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ اسے ہلکی اور ٹھنڈی روشنی ملے تاکہ وہ معمولی کام کاج کر کے شب باش ہو جائے لیکن آخر شب میں جب نیند بھر چکتی ہے اور دنیا کا مزاج تمدن و معاشرت کے بڑے سے بڑے کام انجام دینے کے لئے مستعد ہو جاتا ہے جس کے لئے ایسے تیز روشنی اور مزاج کے ابھار کے لئے قوی حرارت درکار ہوتی ہے تو اسی وقت خاتم الانوار کو چمکا دیا جاتا ہے جو پچھلے انوار کو منسوخ کر کے صرف اپنا نور پھیلا دیتا ہے۔ نہ اس لئے کہ پہلے انوار غلط تھے بلکہ اس لئے کہ ان کا وقت ہی اتنا تھا۔ پس جتنے وقت پر وہ اور ان کی روشنی دنیا سے اوجھل کر دئے گی اتنا ہی ان کا وقت اور دورہ کارگذاری تھا۔ پھر بھی اگر کوئی سورج کی روشنی نمایاں

ہو جانے کے بعد انہی ابتدائی شب کے ستاروں کی روشنی میں ظلمت سے نجات پانے کا متلاشی ہوگا۔ تو اسے کوئی بھی عقلمند انسان عقلمند کہنے کی جرأت نہ کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح خاتم النبیین کی نبوت اور شریعت آجانے کے بعد ابتدائی شریعتوں کے گذرے ہوئے انوار میں نجات ڈھونڈھنا اور انھیں کو ابدالآباد تک باقی رکھنے کی آرزو باندھنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی طلوع آفتاب کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رات ہی کے باقی رہنے اور ستاروں ہی کے قائم رہنے کی خواہش رکھے سو اگر یہ خلاف فطرت ہے تو وہ بھی خلاف فطرت ہے۔ اس لئے اصول کے طور پر متعین ہو گیا کہ دورۂ خاتم کے بعد ابتدائی اور درمیانی دوروں کے قوانین و معمولات نجات دہندہ نہیں بن سکتے۔ اب اگر باقی رہتا ہے تو صرف یہ کہ وہ آخری دورہ کونسا ہے اور کس کا ہے اور کون خاتم النبیین ہیں جن کی آمد کے بعد قوانین سابقہ سب منسوخ ہو کر صرف انہی کے بتلائے ہوئے قانون میں نجات کا انحصار ہو چکا ہے؟

سو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق واقعات سے ہے اور واقعات کے ادراک کے لئے انسان کو دو ہی عظیم قوتیں دی گئی ہیں ایک سمع کہ کسی مخبر صادق سے آدمی واقعہ کو سنکر یقین کرے اور دوسرے بصر کہ آثار و شواہد دیکھ کر ذی اثر کا یقین کرے جیسے دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر سورج کے نکلنے کا یقین کیا جاتا ہے۔ سو جہاں تک خبر صادق کا تعلق ہے کون نہیں جانتا کہ خاتمیت کا دعویٰ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نے نہیں کیا آدم علیہ السلام تو اول النبیین ہیں وہ خاتم ہونے کا دعویٰ کیسے

فرما سکتے تھے اولوالعزم پیغمبروں میں نوح علیہ السلام کا بھی یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ خاتم النبیین ہیں اور کیسے ہوتا جبکہ فرمایا کہ وہ بھی ایک درجہ میں اول النبیین ہی تھے جنھیں آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ کہ طوفان نوح کے بعد ساری دنیا کی نسل انھیں سے چلی اور وہی اول نبی تھے جنھوں نے عالم میں کفر کا مقابلہ کیا سو ابتداء عالم بشریت میں اگر نبوت ختم کر کے مکمل کردی جاتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے بچپن ہی میں کسی کو آخری حکمت کی تعلیم دی جانے لگے اور مبادی ترک کردیے جائیں جو سرتاسر خلاف فطرت ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم ہیں۔ بلکہ انھوں نے تو اور دعا یہ مانگی کہ اے اللہ میری اولاد میں ایسا اور ایسا عظیم الشان نبی پیدا فرما۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے تو آتشین شریعت لانے والے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ خدا کے پہلے گھر میں داخل ہونے والے پیغمبر کی خبر دی حتیٰ کہ اس کی امت تک میں سے ہونے کی تمنا کی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ انھوں نے تو اپنے آنے کی بڑی غرض و غایت ہی اگلے عظیم پیغمبر کی آمد کی بشارت سنانا ظاہر کی۔ ہاں یہ دعویٰ اگر کیا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور فرمایا کہ میں ہی قصر نبوت کی آخری اینٹ ہوں میں ہی وہ ہوں کہ جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ میں ہی وہ ہوں کہ جس پر دین کی تکمیل ہوگئی اور میں ہی وہ ہوں کہ اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے بغیر انھیں بھی چارہ کار نہ تھا پھر ان سے خدا نے بھی انھیں ہی خاتم النبیین فرمایا اور کسی کو نہیں فرمایا نام لیکر

فرمایا کہ

ماکان محمد ابا احد من رجالکم　　محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تھے
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین　　لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین تھے

اس لئے سچی اور مستند نقل وخبر کی روشنی میں یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور ان ہی کا یہ دور آخری دور ہے جس کے بعد کسی شریعت ونبوت کا کوئی اور دور آنے والا نہیں۔

نقل وروایت کے بعد اب سوال عقل ودرایت کا رہ جاتا ہے کہ کیا عقل اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہی وہی آخری نبی اور یہ شریعت وہی آخری شریعت ہے؟ حالانکہ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا کیونکہ سابق میں شریعتوں کی تبدیلی وتنسیخ کا اصول انسانی ذہن کی تبدیلی اور اس کا تدریجی ارتقاء قرار دیا گیا ہے۔ تو کیا یہی صورت آج بھی نہیں ہے کہ انسانی ذہن تبدیلیوں اور انقلابات کا محور بنا ہوا ہے۔ بلکہ آج کی دنیا میں ذہنی تبدیلیاں شاید پہلے کی دنیا سے بھی کہیں زائد ہیں۔ روز روز نظریات تبدیل ہو رہے ہیں اور انسانی مزاج بدلتا جا رہا ہے۔ تو کیسے کہہ دیا جائے کہ انسانی ذہن کسی ایک حد پر آکر ٹھہر گیا ہے جس کے بعد تبدیلی نہیں تو پھر کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ شریعت آخری شریعت ہے جس کے بعد نئے ذہنوں کو اپیل کرنیوالی کوئی نئی شریعت آنیوالی نہیں؟

اس اشکال کو حل کرنے کے لئے اسی تبدیلیٔ ذہن کے اصول پر غور کیجئے جس پر غور نہ کرنے سے اشکال پیدا ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں مختلف شریعتوں کے آنے اور ایک ایک وقت میں کئی کئی نبوتیں اور کئی کئی شریعتیں رائج رہنے کی بنا در حقیقت

دنیا کے مزاجوں کے تفاوت کی رعایت تھی تاکہ ان کے حسب حال وہ مزاجوں
کی مناسبت سے انہیں تربیت دیا جاسکے اور انھیں کے رنگ طبع کے موافق
انھیں خدا کی بندگی اور عبودیت کے لئے تیار کیا جاسکے کیونکہ جب تک مربی اور
سامان تربیت موافق مزاج اور حسب حال نہ ہو آدمی تربیت سے اثر نہیں لے سکتا
ظاہر ہے کہ اگر مزاجوں اور ذہنوں کے احوال کی رعایت کئے بغیر ایک ہی قانون
ان سب کو لاکر دیدیا جاتا جبکہ ان کے مزاجوں میں مشرق و مغرب کے بُعد کے ساتھ
مشرق و مغرب ہی جیسا تفاوت قائم تھا تو وہ کبھی بھی اصلاح پذیر نہ ہوسکتے اگر
قوم سخت مزاج ہے تو شرعی قانون میں بھی شدت اور سختی ہی کے رنگ کی ضرورت
ہوگی نرم قانون اس مزاج کی قوم کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتا۔ نرم خو قوم ہے
تو سہل اور ملائم احکام کی ضرورت پڑتی ہے یہاں سختی قانون کارگر نہیں ہوسکتی۔
حکمت پسند قوم ہے تو قانون تربیت بھی حکیمانہ رنگ کا ہونا چاہئے اور سادہ لوح
قوم ہے تو قانون کی بھی سادگی ناگزیر ہے۔ بچوں کے لئے ابتدائی درجہ ہی کی تعلیم
مفید ہوتی ہے انھیں اگر حکمت کی اونچی باتیں ابتدا ہی میں بتائی جانے لگیں تو وہ
کبھی بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اور بڑوں کے لئے اونچی باتیں اور اونچی
تعلیم ہی موثر ہوسکتی ہے اگر انہیں حروف ابجد سکھائے جانے لگیں تو وہ ہنسکر استاد
کو بھی مضحکہ بنا دیں گے۔ اس لئے شریعتیں دنیا میں حسب مزاج اقوام لائی گئیں
اور مربیان شرائع (انبیاء علیہم السلام) بھی مختلف قوموں کے حسب حال ہی تعلیم
و تربیت کے مختلف پروگرام لیکر مبعوث ہوئے۔

جیسے ارشاد حق ہے۔

لکل جعلنا منکم شرعۃً و منھاجا۔
ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم) کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ رکھی۔

جس سے شرائع کا اختلاف ثابت ہے۔ اسی کو حدیث نبوی میں بطور تشریح دبیان اس انداز سے ظاہر فرمایا گیا کہ

نحن معاشر الانبیاء بنو العلّات ابونا واحد وامھاتنا شتی
ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں باپ ہمارا (یعنی دین) ایک ہے اور مائیں ہماری (یعنی شریعتیں) الگ الگ ہیں۔

اسی لئے یہ مقدسین کرام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر قوم میں الگ الگ اور ہر خطہ میں جدا جدا بھیجے گئے۔

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔
کوئی امت نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

ولکل قوم ھاد۔
ہر قوم میں ہادی آیا۔

ولکل امۃ رسول۔
ہر امت میں رسول آیا۔

نیز حسب رنگ اقوام رنگ بھی مختلف لیکر آئے۔

یہود تند خو تھے تو موسیٰ علیہ السلام جلالی پیغمبر دیئے گئے۔ نصاریٰ نرم خو تھے تو عیسیٰ علیہ السلام جیسے جمالی پیغمبر دیئے گئے۔ سبا کی قوم بادشاہت پسند تھی تو سلیمان علیہ السلام جیسے شاہانہ رنگ کے پیغمبر دیئے گئے۔ نمرود کی قوم نجومی رنگ کی قوم تھی تو ابراہیم علیہ السلام جیسے عارف ملکوت سمٰوٰت پیغمبر عطا کئے گئے۔ غرض جیسا قوم کا رنگ ہوا ویسا ہی رنگ پیغمبری بھی

رکھا گیا۔ پھر اسی عنوان سے کتابیں بھی مختلف آئیں اور مختلف انداز کے اصول تربیت لیکر آئیں جن پر انہی کی قدر مخاطب امت کی آخرت میں جزا رکھی گئی۔

کل اُمۃ تدعیٰ اِلیٰ کتابھا الیوم تجزون ما کنتم تعملون۔	ہر امت اپنی ہی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج کے دن تم کو اپنے کیے کا (جو اس کتاب کے مطابق تھا) بدلہ دیا جائے گا۔

اسی اصول پر قبلے مختلف رکھے گئے تاکہ یہ مختلف امتیں اپنے اپنے رنگ سے ان کی طرف رُخ کر کے یاد خداوندی میں لگیں۔

ولکل وجھۃٌ ھو مولیھا۔	اور ہر امت کے لئے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رُخ رکھتی ہے۔

بہرحال ہر قوم میں ہر خطہ میں انبیاء آئے اور ان قوموں کے مناسب حال شریعتیں اور قانون حق کی کتابیں لائے جن سے ان کی اصلاح فرمائی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ ہر قوم کا قانونی مزاج الگ الگ تھا اس لئے اس کا قانون بھی اسی کے حسب حال الگ تھا جس سے دوسری قوموں کے مزاج میل نہیں کھاتے تھے۔ اور جو قانون ایک کے لئے تھا وہ دوسری کے لئے نہ تھا شریعتیں بھی الگ الگ تھیں اور نبوتیں بھی جُدا جُدا اصول میں متحد مگر پروگرام میں مختلف۔

اس سے یہ نتیجہ باسانی نکل آتا ہے کہ ان قومی اور وطنی شریعتوں میں کوئی شریعت بھی ساری دنیا کے لئے نہ تھی۔ اور اس لئے نہ تھی کہ وہ ایسی اصولیت و کلیت اور جامعیت لیکر نہیں آئی تھی کہ دنیا کی ساری مختلف المزاج اور مختلف المذاق قوموں

کے لئے تنہا کافی ہو جاتی جبکہ دنیا کی اقوام ہی میں خود ایسی اصولیت و کلیت اور ہمہ گیر مزاجی کی استعداد نہیں آئی تھی جو بین الاقوامی قانون کی متقاضی اور طلبگار ہوتی اور کسی ایک ہی جامع راستہ اور قدر مشترک یا اصولی نقطہ پر ان اقوام کو جمع کر سکتی اس کی تکوینی اور قدرتی وجہ تو یہ تھی کہ عالم بشریت کی استعداد تدریجاً ہی بڑھی ہے۔ اکدم مکمل نہیں ہوئی جیسے بچہ بتدریج ہی شباب اور بلوغ تک پہنچتا ہے درخت بتدریج ہی تناور درخت ہوتا ہے اور پھل دیتا ہے اس لئے اس کی ابتدائی اور درمیانی حالت طبعاً ناتمام ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عالم بشریت کے اجزاء بتدریج بلوغ تک پہنچتے ہیں خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوان و انسان تو قدرتی بات ہے کہ وہی تدریج اس کے مجموعہ کی صفت بھی ہوگی یہ ناممکن ہے کہ عالم کے اجزاء نبات و حیوان اور بشر و انسان تو بتدریج حد کمال تک پہنچیں اور مجموعہ یکدم بام ترقی پر پہنچ جائے جبکہ مجموعہ نام ہی ان اجزاء کا ہے جن میں تدریج مشاہدہ کی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ بلوغ سے پہلے پہلے کی حالت ناقص اور ناتمام ہی کہلائی جا سکتی ہے اگر وہ حد کمال ہوتی تو اسے آگے کیوں بڑھایا جاتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ناتمام یا کمزور حالت کے احکام الگ ہوتے ہیں اور حالت بلوغ کے احکام نابالغ پر اور بالغ پر نابالغ کے احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے تا تکمیل انسانیت جتنے بھی درمیانی قوانین تھے وہ ناتمام ہی انسانیت کے لئے تھے اس لئے وہ خود بھی انسانیت کی طرح تکمیل طلب تھے۔ اس لئے جیسے جیسے انسانی معاشرہ حد کمال کی طرف بڑھتا گیا ویسے ویسے دینی قوانین بھی بتدریج شباب و کمال کی طرف بڑھتے گئے۔ اور جوں جوں انسان کی طبعی مدنیت کے چولے وسیع اور فراخ ہوتے رہے

اور اس کا تمدن ترقی کرتا گیا اسی قدر دین کے شرعی لباس اور شریعتوں کے چولے
بھی اپنے اندر وسعت و فراخی پیدا کرتے گئے۔ تاکہ انسانیت کی تربیت اسکے
ذہن اور مزاج کے حسب حال ہو سکے۔ حاصل یہ ہے کہ دین تمدن کی وسعتوں کی
حد تک ہی وسیع ہوتا گیا ہے۔ تمدن کے جتنے گوشے پیدا ہوتے گئے اور ان کے
راستہ سے انسان کے لئے گمراہی کے احتمالات اور واقعات رونما ہوتے گئے اسی
حد تک ہدایتوں کے گوشے بھی پھیلتے گئے تاکہ ہر ضلالت کے رخنہ کا ہدایت سے
سدباب کیا جا سکے۔ اور اسی لائن سے انسان کو اس کے مالک و خالق کیطرف
متوجہ کیا جا سکے۔ پس ادیان کی یہ تدریجی ترقی و تکمیل حسب تدریج انسانیت
طبعی تھی جس پر یقین لانے کے لئے ظاہری اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں
تاہم جبکہ ہر حقیقت کے لئے اس عالم اسباب میں جو بلا شبہ قدرتی کارخانہ
ہے اظہار قدرت کے لئے اسباب بھی رکھے گئے ہیں اس لئے دنیا کے ابتدائی
اور وسطی زمانوں میں دین کا قومیتوں اور وطنوں کی حدبندیوں میں محدود رہکر وسیع
اور ہمہ گیر نہ ہونا یا بالفاظ دیگر تکمیل طلب رہکر استعداد کی زبان سے آخری تکمیل
مانگتے رہنا جیسے قدرتی ہے ویسے ہی ظاہری اسباب سے موجہ بھی ہے۔
وہ وجہ یہ ہے کہ ہمہ گیر اسباب و وسائل نہ ہونے اور ناواقف طبیعتوں کے انکی
طرف متوجہ نہ ہونے کے سبب ہر قوم دوسری قوم سے الگ ہر خطہ دوسرے خطہ سے
کٹا ہوا اور ہر ملک دوسرے ملک سے بے تعلق رہتا تھا۔ نہ عمومی ریل پیل تھا نہ
ہمہ گیر خلط و اختلاط۔ ہر قوم دوسری قوم سے ناآشنا اور اگر کسی حد تک آشنا بھی ہوتی
تو دور سے کچھ عمومی احوال سن سنا کر نہ تمدن میں اشتراک نہ رسم و رواج میں یکسانی۔

نہ مذاق میں وحدت ہر قوم کے یہاں دوسری قوم ایک افسانہ تھی اور ایک ایسی عجوبۂ روزگار چیز سمجھی جاتی تھی جس کے افسانے مافوق العادت سمجھ کر حیرت سے سنے جاتے تھے اور دل بہلانے کے لئے قصہ کہانیوں میں نوادرِ روزگار کے انداز سے بیان میں آتے تھے جیسے گویا یہ قوم اس عالم کی بسنے والی ہی نہیں بلکہ کسی نئی دنیا کی رہنے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بُعد اور اس تفاوت کے ہوتے ہوئے جب انسانیت کے مذاق و مزاج ہی میں یکسانی اور ہمہ گیری نہیں تھی اور اس مابینی بعد کے ہوتے ہوئے مزاجوں کی یکسانی رسم و رواج کی وحدت خو بو کا اتحاد اور ذہنی رُخ کی ایکتا ممکن بھی نہ تھی۔ تو قانون شریعت و تربیت میں ہمہ گیری اور وحدت کیسے رکھی جاتی کہ سب کا ایک پلیٹ فارم ہو جاتا اور سب کا ایک ہی قانون اور ایک ہی شرعی راستہ ہوتا جس میں قومیت نہ ہوتی بلکہ بین الاقوامیت ہوتی وطنیت نہ ہوتی بلکہ بین الاوطانیت ہوتی۔ اس لئے شریعتیں بھی الگ الگ رکھی گئیں اور قومیتیں بھی الگ الگ آئیں۔ شرائع کے مزاج بھی متفاوت رہے اور مربیانِ دین کے مزاج بھی اقوام کے مزاج کے حسبِ حال جدا جدا رکھے گئے۔ یہ شریعتیں بلاشبہ بایں معنی تو سب کامل تھیں کہ اپنی اپنی قوموں کی نجات کے لئے کافی و وافی تھیں مگر خود بنفسہٖ تکمیل طلب تھیں جامع محض نہ تھیں۔

اور جب شرائع کے جامع نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قومیتوں اور وطنیتوں کے دائرہ میں محدود اور اقوام کے جزوی مزاجوں کی رعایت سے جزوی رنگ میں آئی تھیں تو شریعت کے جامع ہونے کے معنی اسی سے واضح

ہو گئے کہ وہ قومی کے بجائے بین الاقوامی اور وطنی ہونے کے بجائے
بین الاوطانی ہو۔ اور اس میں قوموں کے جزوی مزاجوں کی رعایت کے
بجائے نفس انسانیت اور اس کے کلی مزاج کی رعایت ہو اور اس لئے
وہ کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کے لئے پیغام ہو اور
انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہو سکتا تھا
کہ وہ ساری دنیا کے مزاجوں کی کلی رعایت لیکر آئے اور ایسے ہمہ گیر اصول
و قوانین پر مشتمل ہو جو دنیا کی ساری قوموں کے لئے یکساں قابل قبول ہوں
مگر جبکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ دین تمدن ہی کی وسعتوں کی حد تک وسیع
ہوتا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا جامع دین اسی وقت بھیجا جا سکتا تھا کہ دنیا
کی قوموں کے تمدن اور مدنی مزاج میں ہمہ گیری اور یکسانی کے جذبات پیدا
ہو جائیں اور ان میں قومیتوں کی تفریق کے بجائے عالمگیر بین الاقوامیت کا
مذاق پیدا ہو جائے یہاں تک کہ قومی وطنی نسلی اور طبقاتی حد بندیوں سے
یہ تفریقیں انسانوں کی عقلوں پر شاق گذرنے لگیں۔ آقائی اور غلامی کا فرق
طبائع پر بھاری ہونے لگے۔ شاہی و گدائی کا تفاوت عقلوں کے نزدیک ناگوار
حادثہ شمار ہونے لگے۔ نسلی اونچ نیچ کو لوگ لعنت پکارنے لگیں۔ چھوت
چھات کو ہنر کے بجائے عیب سمجھا جانے لگے۔ ذہنیتوں کی حد بندیاں مٹ کر
ہمہ گیر مساوات کی استعداد پیدا ہو جائے اور اونچ نیچ کے بجائے انسانی
بھائی چارہ اور اخوۃ کی صلاحیتیں ابھرنے لگیں تو یہی وہ وقت ہو سکتا تھا
کہ انسانیت کی یہ فطرۃ ہمہ گیر قانون اور بین الاقوامی شریعت کی خاموش

پکار کرے اور قدرت اسے ایسا ہی جامع قانون بخشدے۔

اس اصول کے بعد اب واقعات کی روشنی میں نظر دوڑائیے کہ یہ استعداد کب ابھری؟ اور کیوں ابھری؟ ظاہر ہے کہ ہمہ گیر مساوات کی استعداد جب ہی ابھر سکتی تھی کہ ہمہ گیر تفریق اور اونچ نیچ انتہائی حدود پر آچکی ہو اور اس سے دنیا تنگ آکر ردّ عمل کی خواہشمند ہو چکی ہو۔ سو تاریخ شاہد ہے کہ قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت دنیا کے لئے اس اونچ نیچ کا انتہائی دور تھا معاشرتی اونچ نیچ نے غلاموں کو نسبی اونچ نیچ نے اچھوتوں کو اقتصادی اونچ نیچ نے نادار مزدوروں کو مذہبی اونچ نیچ نے عوام کو اور سیاسی اونچ نیچ نے رعایا کو بے پناہ مظالم اور تحقیر و تذلیل کا شکار بنا رکھا تھا۔ اونچے لوگ مطلق العنانی کے مقام پر تھے اور نیچ لوگ ڈھوروں اور ڈنگروں کی طرح ان کا یرغمال تھے غلاموں کو معمولی سی کوتاہی اور فروگذاشت پر سانپوں سے ڈسوا دینا اور تالابوں میں ڈھکیل کر ان کے ڈوبنے اور دردانگیز موت کا تماشا دیکھنا برچھیوں کے شکنجوں میں ان کے پرخچے اڑا دینا۔ آقاؤں کا قانونی اور عرفی حق تھا۔ بادشاہ آقائے مطلق ہوتا تھا رعایا اس کی غلام سمجھی جاتی تھی۔ اسے حق تھا کہ کسی گھرانے کے ایک فرد کی کوتاہی پر پورے گھرانے اور خاندان کو کولھو میں پڑوا دے حکمران سلسلہ کے افراد کا رعایا کے افراد سے ناقابل تحمل بیگاریں لینا اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے داد عیش دینا حکمرانوں کا جائز حق تھا۔ مذہبی پیشواؤں کا عوام پر خدا کے نائب کی حیثیت سے ان کے اور ان کے

زن و فرزند کے جان و مال میں ہر قسم کے تصرف کا حقدار ہونا عام بات تھی
روم و فارس کے اونچے تمدن میں امیر اس وقت تک باعزت سوسائٹی
میں آنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ لاکھ دو لاکھ کی مالیت کے
زر و جواہر کے پٹکے۔ زرتار لباس اور مرصع سونے کے تاج اس کے زیب
بدن نہ ہوں۔ یہ سب سامان جاہ و طرب غربا کی محنت و مزدوری کا ثمرہ
ہوتے تھے۔ اور خود غربا بدن چھپانے کے لئے معمولی لباس اور پیٹ
بھرنے کے لئے سوکھے ٹکڑے تک سے بھی محروم تھے۔ گویا غربا حیوانات
کی مانند تھے اور غلام بیلوں اور گدھوں کی طرح تھے۔ جن پر طاقت سے زیادہ
بار ڈالنا اور بہر صورت ان پر ہر تعدی کو جائز اور ہر ظلم کو روا رکھنا ہی
آقائی کی صحیح پوزیشن تھی۔ پھر اوپر سے ان پسماندوں کی ہر چیز اونچوں کے
لئے حلال تھی۔

غرض ہر طبقہ میں طبقاتی اونچ نیچ اپنی انتہائی شرمناک حدود پر آچکی
تھی جس کے تحت ہر اونچ کا جائز حق نیچ کی تذلیل اور ان میں ہر قسم کے تصرف
کا جواز تھا اور نیچ کا واجبی مقام اونچوں کے جابرانہ اختیارات کے سامنے
سر نیاز جھکائے رکھنا اور ہمہ تن اطاعت بنکر حاضر رہنا تھا۔ عدل و مساوات تو
بعد کی چیز ہے نفس انسانیت کا احترام بھی ختم ہوچکا تھا۔ پھر نہ صرف افعال ہی
کی حد تک بلکہ انسانی جوہر کے لحاظ سے اونچوں نے اپنے کو نیچوں سے بالاتر سمجھ رکھا
تھا۔ کچھ طبقات سورج بنسی اور چندر بنسی بنے ہوئے تھے۔ کچھ خدا کے منھ سے پیدا
شدہ تھے۔ اور ان کے مقابلہ میں نیچ مشتِ خاک سہ یا خدا کے پیروں سے پیدا شدہ تھے

گویا اونچ انسانی نوع سے بالاتر کوئی جداگانہ نوع تھی جس کا مادہ تولید بھی عام انسانوں جیسا نہ تھا اور نیچ عام انسانیوں سے نیچے کی سطح کی کوئی نوع تھی جنھیں انسانیت کے حقوق بھی حاصل نہ تھے اور اونچ ہمیشہ کے لئے اونچ اور نیچ ہمیشہ کے لئے نیچ پس اونچ نیچ محض معاشرتی نہیں تھی بلکہ جوہری اور بنیادی تھی اور جوہر انسانی میں بھی طبقاتی تفاوت شامل تھا اس لئے نیچ کا سایہ بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ اس کا پس خوردہ بھی نجس تھا اس لئے انسانی برادری کے معاشرتی تعلقات بھی اس کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر نہ صرف معاشرۃً بلکہ عبادت میں بھی یہ تفریق ایک جائز حق شمار ہوتی تھی۔ اچھوت اور چھوت ایک معبد میں جمع نہیں ہو سکتے تھے برابر کھڑا ہو جانا تو کیا ہی ممکن تھا؟ علم مذہب صرف اونچی ذات کا حق تھا۔ نیچ کے لئے تعلیم مذہب حاصل کرنا بھی ممنوع تھا۔ غرض مختلف اقوام میں اونچ نیچ اور طبقاتی تفریق کی مختلف بھیانک صورتیں رائج تھیں جنھیں حسن معاشرۃ اور صحیح دین خیال کیا جاتا تھا اس کا قدرتی نتیجہ نفرت باہمی اور جذبۂ انتقام کی آگ کا اشتعال ہی ہو سکتا تھا سو ہوا۔ رعایا ملوک پر لعنت بھیجتی تھی اور راعی رعایا کو ملعون جانتے تھے۔ دین و دنیا کی یہ کیفیت کسی ایک ملک یا ایک ہی قوم کی نہ تھی بلکہ عرب و عجم اسی بلا میں پھنسا ہوا تھا اسی لئے اس دور کی اس تباہ حال دنیا کے قلوب پر اسکے خالق نے نظر کی تو پوری دنیا کو غضب آلود نگاہ سے دیکھا جیسا کہ لسان نبوت نے زمانۂ جاہلیت کی اس حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

إنّ اللہ نظر الی قلوب بنی آدم فمقت عربھم وعجمھم	اللہ نے بنی آدم کے دلوں پر نگاہ ڈالی تو عرب و عجم کو غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔

یعنی قلوب میں خیر باقی نہیں رہی تھی روحانیت کے نشانات کم ہو چکے تھے صرف مادیت اور نفسانیت ہی کا دور دورہ تھا۔

اس قومی غرور، وطنی تعصب اور معاشرتی تحقیر و تذلیل سے دنیا تنگ آچکی تھی تو اس کا قدرتی ردّ عمل یہی جذبات ہو سکتے تھے اور ہوئے کہ شریف و رذیل کی یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو نسلی غرور اور قومیتوں کے تعصبات مٹیں، اور یہ تفریقیں ختم ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ان وطنی اور قومی حد بندیوں کے مٹ جانے کی آرزو در حقیقت انسانی اخوۃ و مساواۃ ہی کی آرزو تھی۔ اور آقا و غلام، شاہ و گدا، امیر و غریب حاکم و محکوم کی اونچ نیچ کی فضا ختم ہو جانے کی خواہش در حقیقت وحدۃ باہمی اور ربط مابینی ہی کی خواہش تھی، چنانچہ پسماندہ طبقوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ اور ان اچھوت اقوام کا فکر بدلنے لگا۔ اب وہ اس تحقیر و تذلیل کی فضا، پر قناعت کر بیٹھنے کے لئے تیار نہ رہے بلکہ ردّ عمل کے طور پر ان میں جذبہ یہ پیدا ہو گیا کہ وہ اس تحقیر اور اچھوت پن کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان تفرقوں اور حد بندیوں پر اجتماعیت کے جو محدود تصورات ذہنوں میں جمے ہوئے تھے ان تفریقوں کے ختم ہونے پر وہ بھی ختم ہو گئے۔ اور مدنیت کے وہ عمومی اور ہمہ گیر تصورات ان کی جگہ آگئے کیونکہ اب تک اجتماعیت نسلیت قومیت اور امیر و غریب یا آقا و غلام کی

طبقاتی تفریق اور چھوت چھات سے بٹ کر پارہ پارہ ہو گئی تھی جب وہ ذہنوں میں ایک بوسیدہ لباس کی طرح قابل نفرت اور اتار پھینکنے کے لایق بن گئی تو اس کا طبعی ردعمل یہی ہو سکتا تھا کہ ان تفریقوں کے علی الرغم ہمہ گیر خلط و اختلاط اور باہمی مساوات کی خواہش ابھرنے لگے اور انسانیت گیر اخوہ و ارتباط کے جذبات پیدا ہو جائیں جو انسانی نطرة کا صحیح اور اعلیٰ مقام ہے

بلاشبہ اس جذبہ سے وہ مدنیت کبریٰ جو انسان کی طبع ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مدنی الطبع کہا جاتا ہے اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہونے کے مقام پر آگئی کیونکہ اس کا ابتدائی مقام تو یہ ہے کہ انسان صرف منزلی زندگی میں اجتماعیت کا ثبوت دے اور ایک گھر کے لوگ انس و موانست اور نظم و تنظیم سے زندگی بسر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر منزل کا نظم ایسا ابتدائی نظم ہے کہ اس سے ایک انسان صرف جانوروں سے تو ممتاز ہو سکتا ہے کہ ان کی طرح الگ الگ بھٹوں اور گھونسلوں میں انفرادیت کے ساتھ نہ رہے لیکن انسانی معاشرۃ کے اعتبار سے یہ کوئی قابل ذکر مقام نہیں جسے انسانیت کی تنظیم کہا جائے۔ ابتداء میں انسان اسی طرح زندگی بسر کرتا تھا کہ ہر ہر گھرانہ خود اپنی ہی انفرادی سیادت کے نیچے آیا ہوا تھا جس میں کوئی عمومیت نہ تھی۔ اس کے بعد اس مدنیت میں وسعت آئی تو انسان نے قبائلی زندگی سیکھی جس میں چند گھرانوں کا مجموعہ مل کر اپنا نظم قائم کرنے لگا اور اب وہ منزلی اجتماعیت اسے کھیل نظر آنے لگی جس کی اس کے نزدیک کوئی خاص قدر و قیمت نہ رہی۔ مگر یہ بھی مدنیت کی انتہاء نہ تھی۔ اس لئے انسان کی طبعی مدنیت پسندی اس پر نہ رکی

بلکہ وہ اس سے گذر کر شہری زندگی تک آیا جس میں چند قبائلی باہمی ربط و اتحاد سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے۔ جس سے وہ پہلی قبائلی اجتماعیت بھی انھیں طفولیت محسوس ہونے لگی مگر یہ بھی مدنیت کی انتہا ثابت نہ ہوئی کیونکہ اس تنظیم کا معیار شہریت تھی انسانیت نہ تھی انسانیت کے لحاظ سے یہ شہروں کی تفریق فطرۃ کی اصلی پیاس کا پورا علاج نہ تھا اس لئے انسان نے اس سے آگے ترقی کر کے مدنیت کو ملکی اجتماعیت بنایا اور کئی کئی شہروں پر مشتمل ملکی نظم قائم کیا اور اب اس اجتماعیت کی صورت قبائلی چودراہٹ یا شہری نوابی اور جاگیرداری کی سی نہیں رہی بلکہ حکومت کی سی ہو گئی جس میں مختلف شہروں کا ایک نظام بن گیا اور انسان کے روابط وسیع تر ہو گئے اور دنیا میں مختلف حکومتیں مختلف معیاروں سے قائم ہو گئیں کہیں نسلی ارتباط سے ایک ملک کے لوگوں کا شیرازہ بندھا اور کہیں قومی اور وطنی لحاظ سے اجتماعیت پیدا ہوئی اس نظم کے بعد اسے وہ پہلی شہری اجتماعیت بھی ابجد محسوس ہونے لگی کیونکہ ارتباط باہمی کا ایک وسیع دائرہ اس کے ہاتھ لگ گیا جس سے اس کے مدنی الطبع ہونے کا ظہور زیادہ قوت سے ہونے لگا۔ مگر یہ مدنیت بھی آخری اور انتہائی ثابت نہ ہوئی اور انسان کی فطری اجتماعیت پسندی نے ملکوں پر اقلیمی شان پیدا کر لی کہ کئی ملکوں پر مشتمل ایک اقلیمی نظام قائم ہو گیا جس کے زیر اثر سینکڑوں ملک آ گئے اور انسان کی انسانیت شعاری کا دائرہ اور وسیع اجتماعیت کے راستہ سے کہیں زیادہ وسیع ہو گیا جس سے اندازہ ہوا کہ اس کا مدنی الطبع ہونا طبعی طور پر منزلی زندگی قبائلی زندگی شہری زندگی اور ملکی زندگی تک محدود نہ تھا یہ

بندیاں
خدیاں اس کے ناواقف ماحول کی ناواقفی یا حوصلہ کی بندشوں کا نتیجہ تھیں جوں ہی حوصلہ کو پھیلنے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا فوراً ہی اس کی وسیع فطرۃ کو اپنی وسعت یاد آگئی اور وہ مدنیت عامہ کے اس وسیع میدان میں کود پڑا جس کے سامنے پہلی محدود اجتماعیتیں ماند ہو کر رہ گئیں لیکن یہاں تک پہنچکر اس کی فطرۃ نے اسے اور آگے بڑھایا اور بتلایا کہ یہ بھی ایک حد بندی ہے کہ وہ کسی اقلیم کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ یہ دائرہ پھر جغرافیائی ہے اگر انسان اس حد خاص کا پابند ہو کر اس میں گھر جائے تو اس کی انسانیت جس کا احاطہ ہر احاطہ سے زیادہ وسیع ہے پھر بھی زمینوں کے ٹکڑوں کی پابند اور اس پابندی سے پارہ پارہ ہی رہے گی جس میں اس کی انسانیت کی توہین ہے کہ وسیع کو تنگ کا ماتحت بنا دیا جائے۔ اگر اب تک اس کی انسانیت کے ٹکڑے آقا و غلام امیر و غریب اور اونچ نیچ کی تفریقوں نے کئے تھے تو اب وہی ٹکڑے اقلیموں کے ارضی ٹکڑوں سے ہو گئے۔ جو بہر حال پھر حد بندی اور انسانوں کی وطنی تفریق ہے۔ اس لئے اب اس کی فطرۃ نے مدنیت کبریٰ کا ذہنی نقشہ یہ بنایا کہ وہ جغرافیائی یا نسلی معیار کے بجائے انسانیت کے معیار سے اجتماعیت قائم کرے اور انسانیت جبکہ آقا و غلام، نیچ اور اونچ حاکم و محکوم حتیٰ کہ افراد قبیلہ و شہر اور سکان ملک و اقلیم سب میں مشترک ہے اور اس لئے ان سب سے زیادہ وسیع اور ان سب کے لئے ہمہ گیر ہے۔ تو کیوں نہ انسانیت ہی کے اس وسیع ترین اور جامع ترین معیار سے اجتماعیت قائم کی جائے جس کے احاطہ میں شہر و ملک ہی نہیں ساری اقلیمیں بھی آجائیں اور پوری دنیا کے انسانوں

کا ایک ہی نظام ایک ہی تمدن ایک ہی انداز معاشرۃ اور ایک ہی نوع کے آئین وقوانین ہو جائیں جس سے دنیا میں انسانیت کبریٰ کا ظہور ہو اور انسانیت سارے معیاروں پر غالب ہو کر اپنی برتری کو نمایاں کر سکے اب اندازہ کیجئے کہ اگر اجتماعیت کے ہر پچھلے محدود دائرہ سے نکل کر اوپر کے وسیع دائرۂ اجتماعیت میں آنا اور انسانی اخوۃ ومساواۃ کو وسیع سے وسیع تر اور عالمگیر بنانے رہنا ہی اس کے مدنی الطبع ہونے کی ترقی تھی تو اس مدنیت پر پہنچکر جس میں ساری دنیا۔ کہ انسان ایک بھائی چارہ کے مقام پر آ جائیں یقیناً اس کی مدنیت واجتماعیت کی آخری منزل ہوگی جس کے بعد مدنیت کا کوئی اصولی درجہ باقی نہیں رہتا کیونکہ سارے انسانوں سے مل کر اور انھیں باہم ملا کر اب آخر انسان کے لئے کونسا طبقہ رہجاتا ہے جسے وہ اپنی مدنیت میں شامل کرے؟ اور اس سے بھائی چارہ کے تعلقات اور تمدنی روابط قائم کرے۔ حیوانات تو اس کے بھائی چارہ میں آنے سے رہے کہ وہ ان کی طرف اخوۃ کا ہاتھ بڑھائے۔ جنات آنے سے رہے کہ انھیں اپنی برادری میں شامل کرے۔ ملائکہ آنے سے رہے کہ وہ اس کی برادری میں شامل ہو کر اس کے نظام تمدن کا جزو بنیں۔ رہے انسان تو وہ سب کے سب ایک نظام اجتماعیت میں شامل ہو گئے۔ اس لئے اب کوئی طبقہ باقی نہ رہا جس کے ملانے کے لئے مدنیت کی توسیع کی جائے۔ اور اخوۃ ومساوات کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ اس حد پر پہنچکر کہ پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نظام ہو جائے انسانی اجتماعیت اور مدنیت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس کی اجتماعیت میں کوئی ترقی ممکن ہوگی تو

اسی مدنیت کو خوشنما یا مستحکم بنانے کی جزئیات کی ہوگی نفس مدنیت کی ترقی کا اس کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا اس لئے اسے ہی تمدن کی نوعی انتہا کہا جائے گا جس کے بعد ذہن انسانی کی ترقی کا کوئی اصولی میدان باقی نہیں رہتا بس اسی آخری دائرہ کی اجتماعیت کو عالمی اجتماعیت کہا جائیگا جس کی اخوۃ بھی عالمی، آئین بھی عالمی، قانون معاشرت بھی عالمی ہوگا۔ اور تمدن و مساواۃ بھی عالمی کہلائے گا۔

کیا زمانہ جاہلیت سے رفتہ رفتہ یہی عالمی ذہنیت انسان میں پیدا نہیں ہو رہی تھی، کیا اسی عالمیت کے ٹکڑے ٹکڑے نسلیت، قبائلیت، وطنیت قومیت۔ آبائیت۔ انانیت وغیرہا نے نہیں کر رکھے تھے اور جب زمانہ جاہلیت میں ان معیاروں سے نفرت اور ان کی اونچ نیچ سے وحشت انسانوں میں پیدا ہوئی جو عالمیت کے راستہ میں حارج تھے تو ان کے ذہن سے نکل جانے کے بعد کیا نہیں کہا جائیگا کہ انسانی ذہن عالمی ذہن پر آگیا اور اس میں ہمہ گیری اور عالمگیری کی انتہائی استعداد پیدا ہو گئی؟ بلاشبہ اس کا اقرار کیا جائیگا اور ظاہر ہے کہ عالمی مدنیت کی اس استعداد کے بعد قدرتاً اس کی فطرۃ میں ایک ایسے عالمگیر قسم کے مذہب کی تلاش اور جستجو کا پیدا ہونا امر طبعی تھا جو قومی نہ ہو بین الاقوامی ہو۔ وطنی نہ ہو بین الاوطانی ہو۔ نسلی نہ ہو بین النسلیاتی ہو۔ لسانی نہ ہو بین الالسنتی ہو۔ لونی نہ ہو بین الالوانی ہو۔ کسی ایک طبقہ کو پیغام نہ ہو بلکہ سارے انسانی طبقات کو پیغام ہو۔ اس کا پیغمبر مقامی نہ ہو عالمی ہو۔ اس کی کتاب آنی نہ ہو جہانی ہو۔ اس کا قبلہ ملکی نہ ہو بین الملکی ہو۔

اس کی حفاظت زمانی نہ ہو بین الازمانی ہو۔ اس کی اشاعت جہتی نہ ہو بین الجہاتی ہو۔ اس کی تعلیم زمانی نہ ہو بین الازمانی ہو۔ غرض اس کی ہر چیز ہمہ گیر عالمگیر اور عالمیتی ہو۔ کیونکہ دین قوم کے حسب حال ہو کر ہی اس کے لئے مفید اور اس کی صحیح تربیت کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بموجب تمدن میں عالمیت کی استعداد کا وقت آجائے تو دین بھی اس استعداد کے حسب حال ہونا چاہیئے۔ اور جبکہ مدنیت اپنی وسعت کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر آکر ختم ہو جائے۔ گویا انسان کے مدنی الطبع ہونے کی آخری منزل آجائے کہ اس کے بعد تمدن کی اصولی وسعت کا کوئی میدان باقی نہ رہے تو دین کی بھی آخری تکمیل ہو جانے کہ اس کے بعد نئے دین آنے کا کوئی سوال باقی نہ رہے پس جیسے اس تمدن کے بے انتہاء وسیع گوشوں سے جس جس رنگ کی گمراہی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا جائے اس آخری دین کے بے انتہاء وسیع گوشوں سے اسی اسی رنگ کی دفع ضلالت ہدایتوں کا ابھرتے رہنا بھی حقیقت بنتا جائے جو ان گمراہیوں کے دفاع کا مکمل سامان ہو۔ نہ اس طرح کہ دین کامل تمدن کے گوشے مٹاتا رہے بلکہ اس طرح کہ اس عالمگیر دین میں لوگوں کو عالمگیر تمدن سے ہٹائے بغیر خود تمدن ہی کے گوشوں کو ذریعۂ ہدایت بنا دینے کی قوۃ بھری ہوئی ہو۔

وہ تمدن کے ہر گوشہ سے خدا کا جمال جہاں آرا دکھلانے کی قوتیں لیکر آیا ہو جس کے معنی یہی ہیں کہ اس آخری اور کامل دین میں دنیا و آخرت دونوں ملاکر یکس کر دی گئی ہوں اور جیسے اس کا جزو دیانات ہوں ویسے ہی اس کا جزو معاملات و معاشرت اور ملکیات بھی ہوں اس کی لامحدود ہدایتیں مسجد ہی تک محدود نہ ہوں بلکہ گھر بلو زندگی

سے لیکر عالمی حکومت کی زندگی تک وسیع ہوں۔

پس اگر آج عالمی تمدن کا وقت آگیا ہے اور ضرور آگیا ہے کیونکہ جدید اکتشافات اور نئی ایجادات نے پوری دنیا کو ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کر کے رکھدیا ہے آج اقلیمیں ملک بنی ہوئی ہیں اور ملک محلے بن کر رہ گئے ہیں۔ آج ۷۰ منٹ میں راکٹوں کے ذریعہ پوری دنیا کا چکر لگایا جا سکتا ہے۔ آج انسان زمین کی سطح کو چھوڑ کر سمندروں کی تہ اور فضاؤں کی بلندیوں میں براجمان ہے۔ آج گھر بیٹھے مشرق و مغرب کی آوازیں اور بولیاں انسان کے کانوں میں پڑ رہی ہیں آج وہ سطح زمین سے ابھر کر فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ آج مہینوں کی مسافتیں گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں طے ہو رہی ہیں۔ آج ہفتوں کا کام مشینوں کے راستہ سے لمحوں میں انجام پا رہا ہے حتی کہ اس کے کان آج حال ہی نہیں ماضی بعید کی آوازوں سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں، اخلاق و علوم تک کو تول لینے کی مشینیں سطح دنیا پر نمایاں ہو چکی ہیں جو جسمانیات سے گذر کر عالم معنی تک بھی پہونچ چکی ہیں۔ غرض جبکہ آج کے نئے اختراعات اور اکتشافات نے زمان و مکان اور جواہر و اعراض تک کو لپیٹ کر رکھدیا ہے اور انسان اپنی معاشرہ و مدنیت کے لحاظ سے مقامی نہیں بلکہ عالمی اور عالمی نہیں بلکہ عالمینی ہو گیا ہے تو اس کی قدرتی خواہش ہونی چاہئے کہ اس کا مذہب بھی مقامی یا قومی نہ رہے بلکہ عالمی اور نہ صرف عالمی بلکہ عالمینی ہو۔ پس اگر آج پوری دنیا کا مذہب عملاً ایک نہیں بنا ہے تو کم از کم انسانی جذبات اس نقطہ پر ضرور آگئے ہیں کہ وہ ایک ہی ہونا چاہئے تو آج ہی کا وقت ہے کہ اس میں عالمی مذہب آسمان سے اترا ہوا موجود ہے جو اس جذبہ کی تسکین کے لئے آگے بڑھے اور جہانوں کی اصلاح کا

پیغام دے۔ ظاہر ہے کہ آج کا مذہب وہ نہیں ہو سکتا جو کسی ایک قوم کو پکارے یا ایک وطن کو اپنا کر رہ جائے یا نسلی امتیازات کی راہوں سے انسانیت کے حصے بخرے کرنے پر تلا ہوا ہو یا چھوت چھات کی تعلیم سے انسانیت میں نفرت کی تخم ریزی کرے یا رنگ اور لون کی تفریق سے انسانیت کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ ہو آج کا مذہب یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو مقامی حد بندیوں اور تنگیوں کی تنگنائے میں انسانوں کو پھانسا کرے انہیں غلطی سے مقامی بنانے کی راہ دکھلائے بلکہ آج کا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو اپنے داعی اور پیغمبر اعظم کو عالمینی بتلائے اور اعلان کرے کہ

وما ارسلناك الا رحمة للعلمين	اور ہم نے آپکو تمام جہانوں کیلئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

جو اپنے داعی اول کو عالمینی نذیر بتلائے

ليكون للعلمين نذيرا۔	تاکہ (ہمارا رسول) تمام جہان والوں کیلئے ڈرانے والا ہوگا۔

جو اپنی کتاب کو عالمینی کتاب کہے۔

ان هو الا ذكرى للعلمين	یہ (قرآن کریم) تمام جہان والوں کیلئے ایک نصیحت ہے

جو اپنے قبلہ کو عالمینی قبلہ کہے۔

ان اول بيت وضع للناس للذى ببكة مباركا وهدى للعلمين	یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کیلئے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے۔

جس کا رسول کسی ایک قوم یا صرف ایک زمانہ کے انسانوں کو نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کو جو قیامت تک پھیلا ہوا ہے اصلاحی آواز دے۔

قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعًا۔ — اے محمد آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کیلئے اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

جس کی بشیری و نذیری اس کے خدا نے کسی دور کے ساتھ مخصوص نہ کی ہو۔

وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا۔ — اور ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے

جس کا پیغمبر انسانوں میں کالے اور گورے کی تفریق کئے بغیر سب کے سروں پر رحمت و شفقت کا ہاتھ رکھے اور اعلان کرے کہ

بعثت الی الاسود والاحمر۔ — مجھے سرخ و سیاہ (تمام اقوام عالم کی ہدایت کے لئے) بھیجا گیا ہے۔

جو آقا و غلام کی تفریقیں مٹانے کے لئے آیا ہو۔

یدخل فی امتی حر و عبدٌ — میری امت میں آزاد اور غلام (سب) داخل ہیں

جو انسانوں کو ان کے جوہر کے لحاظ سے اونچ نیچ کا تصور مٹا کر مساوات کا اعلان فرمائے۔

کلکم بنو آدم و آدم من تراب — تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے

جو نسلی امتیازات کو ختم کرنے آیا ہو اور فرمائے کہ

یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا۔ — اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

جو وطنیت کی حد بندیوں کو مٹانے اور پوری دنیا کو ایک وطن بنانے کیلئے آیا ہو۔

ان اللہ زوی لی الارض مشارقہا — اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے کر دی

ومغاربها وسیبلغ ملک امتی ما زوی لی منها — (جیسے میں نے دیکھا، عنقریب میری امت کا ملک دیار اگر پہنچے گا جہاں تک میری نگاہوں نے دیکھا یعنی مشرق و مغرب تک)

جو وطنی غرور کو ختم کرنے کے لئے آیا ہو۔

لیس لعربی علی عجمی فضل الا بالدین وتقوی۔ — کسی عربی کو کسی عجمی پر دین و تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

جو قومیتوں کی حد بندیاں ختم کرنے کے لئے آیا ہو۔

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ — دوسرے انبیاء صرف اپنی قوم ہی کی طرف بھیجے جاتے تھے اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

جس نے چھوت چھات مٹانے کا اعلان کیا اور کفار کے ہاتھ کا کھانا پینا جائز رکھا۔

الیوم احل لکم الطیبات و طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم۔ — آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے۔

اور خلاصہ یہ کہ جو ایمانی اخوۃ کیساتھ انسانی اخوۃ کا بھی علمبردار بن کر آیا ہو تا کہ انسان میں انسان سے نفرت کا تخم باقی نہ رہے۔

اَللّٰھُمَّ اشھد انّ النّاس کلھم اخوۃ۔ — اے اللہ تو گواہ رہ کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

جو سارے انسانوں کی خدمت کا نصب العین لیکر آیا ہو۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق — تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک

الی اللہ من یحسن الی عیالہ — سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو اسکے کنبہ کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔

جو اس انسانی بھائی چارہ کے لئے باہمی ہمدردی کی تعلیم لیکر آیا ہو کہ

احب لاخیک ما تحب لنفسک — اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو

جو غلاموں کو بھائی بتاتا ہوا آیا ہو۔

اخوانکم خولکم۔ — تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔

جس نے اخلاقی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔ — آپ کہدیجئے کہ زمین کے اندر چلو پھر دیکھو کہ تکذیب کرنیوالوں کا کیسا (عبرتناک) انجام ہوا ہے

جس نے تجارتی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا و کلوا من رزقہ والیہ النشور — وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا سو تم اس کے رستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

جس نے تعلیمی سفروں کو عام کیا۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ — سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ان کے پاس واپس آکر ڈرائیں تاکہ وہ لوگ احتیاط رکھیں۔

غرض اس کی ہر تعلیم میں عمومیت جامعیت اور بین الاقوامیت کی روح دوڑ رہی ہو جس نے ہر قوم کے ساتھ انتہائی رواداری کی تعلیم دی ہو اور منافرۃ کا بیج مٹا دیا ہو۔ سو بتلایا جائے کہ وہ مذہب آج اسلام کے سوا کونسا ہے اور جو تعلیمات اوپر ذکر کی گئیں یہ اس کی نہیں ہیں تو اور کس کی ہیں؟ اور اس کے سوا کون ہے جو انسانی معاشرہ کو مقامی کے بجائے عالمی اور نہ صرف عالمی بلکہ عالمینی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے آج کی عالمی دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے جو تمدن کے کسی بھی گوشہ کو مٹائے بغیر اسی گوشہ سے ملاک کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں اس نے عالمیت اور عالمی اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے یہ ہمہ گیر تعلیم اور ہمہ گیر انس وانسانیت کی طرف راہ نمائی کی ہے جس کے تحت اقوام عالم سے موانستہ اور مسالمت کی راہیں کھلتی ہیں اور منافرت ختم ہو جاتی ہے وہیں اس نے معاشرہ میں مسلم قوم کا شخصی وجود قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلط ملط ریل میل، ربط ضبط اور ذاتی الفت و مودۃ سے روکا بھی ہے تاکہ ان کے اسلامی استقلال میں فرق نہ آئے۔ لیکن اجتماعی معاملات اور عمومی معاشرۃ میں اس ریل میل سے بجکم رواداری حسن سلوک مواساۃ دفع مظالم امن پسندی اور دفع منافرۃ کے جذبات کو عام بنانا چاہا ہے تاکہ اس کے بین الاقوامی معاملات میں فرق نہ آئے جو بالآخر اسلامی اشاعت اور عمومی دعوت و تبلیغ کا وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب ایسی ہمہ گیر تعلیم و تربیت دوسرے مذاہب لیکر ہی نہیں آئے بلکہ اسلام ہی یہ انسانیت گیر تعلیم و تلقین لے کر آیا ہے تو اس کا غیر مسلموں سے

مودۃ و اختلاط بے جا کو روکنا درحقیقت نفرت باہمی سے روکنا ہے نہ کہ نفرت پیدا کرنا ہے کیونکہ وہی تو نفرت کا سرچشمہ ہے جن کے اختلاط سے روکا جا رہا ہے تو یہ روکنا تعصب سے نہیں بلکہ عالمگیر مقاصد کے تحفظ کے لئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ذہنیت جب بین الاقوامی رنگ کی استعداد پر آگئی جیسا کہ اس امت کی ابتداء میں اونچ نیچ سے تنگ آکر مساوات اور اخوۃ باہمی کی ذہنیت پیدا ہوئی اور آج وہی ذہنیت استعداد سے گذر کر فعلیت کی صورت میں نمایاں ہے جبکہ اسی ذہنیت نے نئی نئی عالمگیر ایجادات کر کے اس عالی ذہنیت کو فعلاً عالمی بنا دیا ہے تو بین الاقوامی شریعت بھی خدا نے اسی ذہنیت کے دور میں اتاری جو اسلام کے سوا دوسری نہیں ہے۔ پس اسلام کو اسی دور میں آنا چاہئے تھا جس دور میں انسان کا مزاج بین الاقوامی بننے کا پرواز پڑا۔

غور کیا جائے تو آج بین الاقوامیت اور ہمہ گیری اپنی نوعیت کے لحاظ سے اصولاً انتہا کو پہنچ چکی ہے جس کے بعد اس میں اصولی نوعیت کا کوئی درجہ باقی نہیں اور جس میں اصولاً اور نوعاً کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں کہ ذہن انسانی کو آگے بڑھنے کی گنجائش ہو۔ ہاں کمی بیشی ہوگی تو وہ جزئیات و فروعات میں ہوگی نہ کہ بین الاقوامیت کے دائرہ میں کیونکہ جب ساری دنیا کے انسان ایک قوم بن جانے کے مقام پر آچکے ہیں تو آگے انسان ہی نہیں رہتا کہ رشتۂ اخوۃ آگے بڑھے جیسا کہ ابھی واضح ہو چکا ہے تو عوامیت کے نقطۂ نظر سے مدنیت کا آخری نقطہ آپہنچا جس کے بعد بین الاقوامیت کا کوئی مقام باقی نہیں رہا کہ انسان اس سے آگے کسی اور عمومیت کی تلاش کرے اور مدنیت کا دائرہ وسیع ہو۔ اس لئے ابھی

ذہنیت کے مناسب حال دین بھی ایسا عمومی اور عالمی بھیجدیا گیا کہ اس کے بعد دین و شریعت کا بھی کوئی اصولی مقام باقی نہیں رہا کہ دین اس کے آگے بڑھے یا کسی نئے دین کی ضرورت پڑے۔

اس لئے اب اگر دینی ترقی ہوگی تو اسی دائرۂ عمومیت میں رہ کر ہوگی اس سے نکل کر نہیں ہوگی سو ایسی ترقی جزئیاتی کہلاتی ہے جو کسی اصول کے دائرہ میں محدود رہکر ہو۔ مثلاً اگر انسان زمین سے آگے بھی بڑھے گا تو زمین یا مکان ہی کے نام پر آگے بڑھے گا نہ کہ انسانیت کے بھائی چارہ کے نام پر کیونکہ دنیا کی پوری انسانیت کے نظام اخوۃ میں آجانے کے بعد آگے کوئی نسلی بھائی ہی نہیں رہتا کہ اس سے رشتۂ اخوۃ قائم کیا جائے اس لئے مدنیت اصولاً اپنی آخری حد پر آچکی ہے اور اجتماعیت بھی اپنے آخری نقطہ پر آپہنچی جس کے بعد کوئی نقطہ نہیں اس لئے دین بھی آخری آجانا چاہیئے کہ اس کے بعد اصولاً دین کا کوئی نقطہ باقی نہ رہے۔ البتہ جیسے اس خاتم المدنیت تمدن میں اسی کے اصول کے تحت بیشمار فروع نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی جو ایجادات سے نمایاں نکلتی رہیں گی۔ ایسے ہی خاتم الادیان دین سے بھی اس کے جامع اصول کے تحت فروعات نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی جو اجتہادات سے برآمد ہوتی رہیں گی۔ نفس دین اور اس کے قواعد و اصول نہ بدلیں گے اور نہ جدید قواعد و اصول آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی رہی ہے۔

پھر جیسے اول النبیین آدم علیہ السلام کے ابتدائی کنبہ کو ابتدائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی ایسے ہی خاتم النبیین کے دورہ میں آدم کے

انتہائی اور بوڑھے کنبہ کو انتہائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی جس سے شاخیں تو بے شمار نکل سکتی ہیں مگر جڑ اور تنہ ایک ہی رہے گا۔ پس جیسے دنیا کی مدنیت کے قوی حد بلوغ پر آ گئے اور اب اس میں اصولاً نشو و نما کی گنجائش نہیں رہی اگر گنجائش ہے تو نئی نئی شاخوں اور نئی نئی جزوی ایجادوں کی ہے جن کے اصول ہمہ گیر رنگ کے ہاتھ لگ چکے ہیں جن کی روشنی میں ماہرین سائنس نئی نئی اشیاء نکالتے رہیں گے۔ ایسے ہی دین بھی جو آدم سے چلا تھا نشو و نما پا کر حد بلوغ کو پہنچ گیا ہے اور اب اس میں نشو و نما کی گنجائش نہیں رہی اگر ہے تو فروعی مسائل پیدا ہوتے رہنے کی ہے کہ اس کے اصول کی روشنی میں مجتہدین امت اور مفتیان بالبصیرت اس کے قواعد و ضوابط سے زمانہ کے حسب حال فروعات نکالتے رہیں گے اور امت کی تربیت ہوتی رہے گی جو ائمہ ہدایت اور علماء و مشائخ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ کسی جدید نبوۃ کی حاجت باقی نہیں رہی غرض آج جو معاملہ بھی ہے وہ سارے انسانوں کا ہو گیا ہے اور سارے انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر کا ذہن ہی آخری ذہن ہے کہ اس کے بعد ذہن انسانی کے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اگر کسی نئے خطہ کی دریافت ہی ہو گی تو وہ بھی ان ہی سارے انسانوں کے لئے ہو گی۔ غرض تمدنی دنیا میں بشریت کے عموم کی اصولی حد آ گئی جس کے بعد بشریت بھی نہیں رہتی تو بشر عالم بشریت سے آگے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہنی پرواز کا اصول ختم ہو جاتا ہے آگے صرف اسے عملی جامہ پہنانے کے طریقے رہ جاتے ہیں تو وہ فروع ہیں جو اس ہمہ گیر انسانیت کے لئے انسان میں سے ابھرتے رہیں گے جن سے اس ہمہ گیر انسانیت پر گھٹنے

بڑھنے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ خلاصہ یہ کہ جب ذہن انسانی کی پرداز اصولاً ختم ہو گئی تو نئے اصولوں کی مانگ بھی ختم ہو گئی اس لئے نئے دین کے آنے کا کوئی مقتضی بھی باقی نہ رہا کہ نیا دین آئے، یا نئی نبوت آئے۔ اس لئے اس دور خاتم الادوار میں دین خاتم الادیان بھی آنا چاہیے تھا جو آ گیا۔ اور پچھلے مقامی اور محدود ادیان اسی طرح منسوخ ہو گئے جس طرح خاتم المدنیت تمدن آ جانے کے بعد پچھلی محدود مدنیتیں منسوخ ہو کر ختم ہو گئیں اور جیسے یہ پچھلی مدنیتیں اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھیں بلکہ اس وقت کی انسانی ذہنیتوں کا مقتضا تھیں وہ اگر منسوخ ہوئیں تو ذہن انسانی کی تبدیلی سے جو ارتقاء پذیر تھا۔ ایسے ہی پہلے ادیان بھی اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھے بلکہ اس وقت کے انسانی ذہنوں اور مزاجوں کے مقتضا اور ذہنی یکادر کے مطابق تھے وہ اگر منسوخ ہوئے تو انسانی ذہن کی تبدیلی سے جو ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا اب جبکہ اس کی اصولی دوڑ بھی ختم ہو گئی کہ انسانی اجتماعیت کا انتہائی کنارہ آ گیا تو وہ اصولاً مختتم ہو گیا۔ ایسے ہی جبکہ دین کے اصولی اکمال کا وقت آ گیا تو وہ بھی اصولاً ختم ہو گیا ہمہ گیر فروغ کی گنجائش تمدن میں بھی ہے اور تدین میں بھی سب دہ چلتی رہے گی۔ اب جیسے پچھلے تمدنوں کو دوبارہ لوٹانے کی کوشش کرنا ذہن انسانی کے لئے چیلنج ہے ایسے ہی اسلام آ جانے کے بعد پچھلے مذاہب کو لوٹانے کی سعی کرنا ذہن انسانی کو ترقی معکوس کی طرف لیجانا ہے جس کے لئے فطرت کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ بس جیسے یوں کہا جائے کہ اب زندگی کا انحصار موجودہ تمدن میں ہے اسے چھوڑ کر آج دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی نہ بچاؤ ہو سکتا ہے

جیسے گن اور بم سے الگ ہو کر تیر کمان اور تیشہ و تبر پر آجائے تو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا یا عالمیت پیدا ہو جانے کے بعد کوئی شخص پھر وہی قدیم گھریلو یا قبائلی یا شہری قسم کے محدود و تمدنا پر چلنے کی کوشش کرنے لگے تو وہ تمدنی آفات سے نجات نہیں پا سکے گا۔ جب تک اسی تمدن کی پناہ نہ پکڑے جو وقت کے تقاضوں سے برسر ظہور آیا ہوا ہے۔

ایسے ہی یوں بھی کہا جائے گا کہ دین کامل آجانے کے بعد اخروی زندگی اور نجاۃ کا انحصار اسی دین میں ہے۔ اسے چھوڑ کر پچھلے ناتمام ادیان میں (جو اس وقت کے انسانوں کے لئے کافی تھے مگر تام و کامل نہ تھے) نجاۃ ڈھونڈھنا آخرت میں بچاؤ نہیں کر سکتا۔ وھو اخرۃ من الخاسرین۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا۔ اور وہ تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

غور کرو تو خاتم النبیین کے دین کی یہ خصوصیت بھی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اسلام آجانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین سے روشنی ڈھونڈھنا گھاٹے اور خسارے کی بات ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ یوں کہا جائے کہ آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی ستارہ سے کوئی روشنی ڈھونڈھنے لگے تو وہ کام نہیں چلا سکتا

گھاٹے میں پڑ جائے گا۔ جیسے یہ غیر معقول ہے ایسے ہی وہ بھی غیر معقول ہے۔ پس ستارے اپنے اپنے وقت میں اپنی دھیمی اور مناسب وقت روشنی سے انسانوں کو فائدہ پہنچاتے رہے جو اپنی اپنی جگہ صحیح تھی مگر رات کو دفع کرنے کے لئے جب سورج طلوع ہو گیا اور ستارے روپوش ہو گئے تو ان کا چھپنا ان کے غلط ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی حالت کارکردگی ختم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نیز اس لئے کہ ان کی کارکردگی کا وقت رات کی تاریکی تھی۔

طلوع آفتاب کے بعد دن میں صرف آفتاب ہی مفید خلائق اور کارگذار ثابت ہو سکتا ہے دن میں ستاروں کا کام نہیں رہتا کہ رہنمائی کا کام کر سکیں۔ بہر حال اس تمثیل سے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ناسخ الادیان ہونا اور اپنے دورہ میں اسی میں نجاۃ کا منحصر ہونا اور اس کا اسی مشینی تمدن اور عالمی مدنیت کے دورہ میں آنا اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔ فللہ الحمد

خلاصہ یہ کہ آفتاب نبوت بشری ازل سے چمکا اور کائناتی ابد تک چمکتا رہے گا۔ اس دوران میں نہ اس کے نور کا کسی وقت انقطاع ہوا اور نہ ہوگا کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ روشنی اسی کی کام کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔

اول ما خلق اللہ نوری	سب سے پہلے میرے ہی نور کو اللہ نے پیدا
کنت نبیا و آدم بین	کیا میں اس وقت نبی تھا جبکہ آدم مٹی اور پانی

الماء والطین — کے درمیان ہی تھے (اور انکے ڈھانچہ کا خمیر ہی کیا جا رہا تھا)

انا اول من تنشق منہ الغبراء۔ — سب سے پہلے میں ہی قبر سے اٹھونگا

انا اول من یفتح باب الجنۃ — سب سے پہلے میں ہی جنت کا دروازہ کھولونگا

فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین — پس میں ہی قصر نبوۃ کی آخری اینٹ ہوں اور میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

غرض بشری ازل سے بشری ابد تک اولیت کے ساتھ اور خاتمیت کے ساتھ یہی نور چمکتا رہا اور چمکتا رہے گا۔ نہ اس کے لئے انتہا ہے نہ اختتام اور اسی کے فیضان سے کائنات چمکتی رہی اور مختلف دوروں میں چمکتی رہے گی۔

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو سما کرے ابھار کر
اکبر اُسی کا ورد تو صدق سے بار بار کر
صَلِّ عَلٰی محمدٍ صَلِّ عَلٰی محمدٍ

آفتاب کی تشبیہ کی روشنی میں ختم نبوت کے یہ چند اساسی پہلو تھے جنھیں طالب علمانہ رنگ سے پیش کر دیا گیا یادداشت میں بعض اور پہلو بھی اجمالاً درج کر لئے گئے تھے۔ لیکن ہجوم کار مہلت نہیں دیتا کہ انھیں بھی تفصیل سے، یا اجمال ہی سے کسی ترتیب سے

پیش کرنے کا وقت نکالا جائے اور فرصت کے انتظار اور امید و بیم کی تاخیر کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ مرتب شدہ ذخیرہ بھی رہ جاتا اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا اس لئے ان کی تسوید تبییض کا انتظار کئے بغیر جو پہلو مرتب ہو گئے وہی پیش خدمت کر دئے گئے۔ حق تعالےٰ قبول فرمائے۔

والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصلحت۔

والحمد للہ اولاً و آخراً۔

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۲ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ

ادارۂ عثمانیہ لاہور

ان معاونین کی خدمت میں بطور خاص
ہدیۂ سپاس و تشکر پیش کرتا ہے کہ جن حضرات
نے انتہائی سعی و کوشش کے ساتھ ادارہ
کے لئے بڑی تعداد میں معاون فراہم
فرمائے۔

جزاکم اللہ فی الدارین خیراً

مینجر ادارہ

باشندگانِ پاکستان کیلئے خوشخبری

ادارہ عثمانیہ لاہور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ و دیگر اکابرین کی تصانیف بطریق ادارہ تاج المعارف دیوبند ہر دو ماہ بعد قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ صرف ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بنام "ناظم ادارہ عثمانیہ" روانہ فرماکر مستقل ممبری سے کارکنانِ ادارہ کی ہمت افزائی فرمائیے۔ نیز اپنے و دیگر احباب کے مکمل پتوں سے ادارہ کو مطلع فرماکر خدمت کا موقعہ دیجیے۔

منتظرِ خدمت:۔

ناظم ادارہ عثمانیہ لاہور